فہرست

دیباچہ

کتاب:

My Work on Islam -

جلد چہارم

الحمد للّٰہ ربّ العالمین، والصلاۃ والسلام علیٰ سید الانبیاء والمرسلین، وعلیٰ آلہ و اصحابہ أجمعین۔

یہ چوتھی جلد دراصل ”مائی ورک آن اسلام“ کی تمام پچھلی جلدوں کا نچوڑ اور خلاصہ ہے۔ اس میں وہ اصل بنیاد پیش کی گئی ہے جو ایمان اور کفر کے درمیان حدِّ فاصل کو واضح کرتی ہے — تاکہ ہر صاحبِ عقل

سمجھ سکے کہ ایمان کی ابتدا کہاں سے ہوتی

ہے اور اس کا کم از کم درجہ کون سا ہے۔

میری تمام جلدوں میں بنیادی مقصد یہی رہا

کہ انسان کے دل میں معرفتِ الٰہی کا نور

پیدا ہو، کیونکہ ایمان کی جڑ معرفت ہے۔

جب دل اپنے رب کو پہچان لیتا ہے تو اس

کی بندگی، اطاعت، محبت اور خوف سب

حقیقت کے قریب آ جاتے ہیں۔ معرفتِ الٰہی

کے بغیر عبادات رسمی بن جاتی ہیں، اور جب

معرفت پیدا ہو جائے تو ایک معمولی عمل

بھی نورِ ایمان سے لبریز ہو جاتا ہے۔

یہ کتاب اسی معرفت کی طرف رہنمائی کرتی

ہے — وہ معرفت جو انسان کو مخلوق سے

ہٹا کر خالق کی طرف متوجہ کرتی ہے، جو

بندے کو بندگی کی حقیقت سمجھاتی ہے، اور

جو ظاہر و باطن دونوں کو ایک ہی رب کی

غلامی میں جمع کر دیتی ہے۔

اگر پچھلی تین جلدوں میں تفصیل تھی تو یہ

جلد اس کی روح ہے؛ ان کی حکمت کا

خلاصہ اور ان کے مفہوم کا مرکزی نکتہ۔

میری سعی یہی ہے کہ پڑھنے والا یہ سمجھے

کہ ایمان محض تصدیقِ زبانی نہیں، بلکہ رب

کی پہچان کے بعد دل کی کیفیت کا نام ہے

— وہ کیفیت جو بندے کو رب کے قریب

کر دیتی ہے۔

یا اللہ! اس کوشش کو اپنی بارگاہ میں قبول فرما، اور ہمیں سچا ایمان، معرفت اور اخلاص عطا فرما۔

آمین یا رب العالمین۔

✍ ادنیٰ خادمِ علم و ایمان،

عدنان خان

ــــ

گناہوں سے بچنا اور نیکیوں کا کرنا مقصودِ

اصلی نہیں، بلکہ اصل ترجیح اللہ کو پانا ہے۔

جب بندہ اللہ کو پا لیتا ہے تو اللہ خود ہی

اس کے گناہ معاف فرما دیتا ہے، نیکیوں کی

توفیق عطا کرتا ہے، اور لازوال اجر سے نوازتا

ہے۔

لیکن جو اللہ سے محروم رہ جائے، اس کے

گناہ معاف کرنے والا کوئی نہیں؛ نہ سزا اسے

سنوار سکتی ہے، نہ بیماری اسے پاک کر

سکتی ہے۔

لہٰذا اصل کوشش یہی ہونی چاہیے کہ بندہ اللہ

کو پالے۔

ہدایت کی دعا اور طلب ہمیشہ جاری رکھے،

اللہ کو حاکمِ مطلق اور مخلوق کو اس کا

محکوم مانے، اور اپنی استطاعت کے مطابق اللہ

کے احکامات پر عمل کر کے اس کے قریب

ہونے کی کوشش کرے۔

آدمی اور کفر کے درمیان فرق: ھدایت کی دعا و طلب

ھدایت کی طلب ہر جن و انس پر فرض ہے۔

وجہ یہ ہے کہ ہم سب ھدایت میں اللہ کے

محتاج ہیں اور ھدایت کی ہمیں ضرورت ہیں

۔

آدمی اور کفر کے درمیان فرق: ہدایت کی دعا و طلب

انسان اور کفر کے درمیان اصل فرق "ہدایت کی دعا و طلب" ہے۔ جس کے دل میں ہدایت کی چاہ ہو وہ آخرکار راہِ حق کو پا لیتا ہے، اور جو اس طلب سے غافل ہو وہ اندھیروں میں بھٹکتا رہتا ہے۔

مکہ کے مشرکین کی گمراہی

مکہ کے مشرکین نے ہدایت کی دعا کرنے کے بجائے الٹا کہا:

" <وَإِذْ قَالُوا اللَّهُمَّ إِنْ كَانَ هَٰذَا هُوَ الْحَقَّ مِنْ عِنْدِكَ فَأَمْطِرْ عَلَيْنَا حِجَارَةً مِنَ السَّمَاءِ أَوِ ائْتِنَا بِعَذَابٍ أَلِيمٍ"

(الأنفال 8:32)

یعنی بجائے یہ کہنے کے "اے اللہ! اگر یہ

حق ہے تو ہمیں اس کی ہدایت دے" انہوں

نے کہا "اگر یہ حق ہے تو ہم پر آسمان

سے پتھر برسا دے یا کوئی دردناک عذاب لے

آ۔" یہ ان کی ضد اور ہدایت سے بے نیازی

کی علامت تھی۔

اسی طرح سورة المدثر میں کفار کی ہدایت

سے غفلت کو یوں بیان کیا گیا

" <مَا سَلَكَكُمْ فِي سَقَرَ (42) قَالُوا لَمْ

نَكُ مِنَ الْمُصَلِّينَ (43) وَلَمْ نَكُ نُطْعِمُ

الْمِسْكِينَ (44) وَكُنَّا نَخُوضُ مَعَ الْخَائِضِينَ (45)

وَكُنَّا نُكَذِّبُ بِيَوْمِ الدِّينِ (46) حَتَّى أَتَانَا

الْيَقِينُ" (47) ◌ُ

(المدثر (47—42 : 74

کفار کے جہنم جانے کی وجہ یہ ہے کہ انہیں

حق اور باطل سے کوئی لینا دینا نہیں تھا،

ہدایت کی طلب نہیں تھی، ساری عمر کھیل

کود میں گزر گئی، یہاں تک کہ مرتے دم

تک یہ معلوم نہ کر سکے کہ مرنے کے بعد

بھی زندگی ہے اور مرنے کے بعد کی زندگی

کے لئے کچھ لے کر جانا ہے، مثلاً مسکین کو

کھلانا ہے۔

رسول اللّٰہ ﷺ نے فرمایا

طَلَبُ الْعِلْمِ فَرِيضَةٌ عَلَى كُلِّ مُسْلِمٍ (ابن ماجہ 224) -

ترجمہ: علم کی طلب (دعا) ہر مسلمان پر فرض ہے ۔

درجہ: یہ حدیث ضعیف ہے لیکن یہ جملہ (طَلَبُ الْعِلْمِ فَرِيضَةٌ عَلَى كُلِّ مُسْلِمٍ) طرق اور

شواہد کی بناء پر صحیح ہے۔ (اسلام ون ایپ)

آسمانی علم ہدایت ہے۔

حدیث میں ہدایت کی طلب کی اہمیت

نبی کریم ﷺ نے اللہ کا فرمان بیان کیا:

" >يَا عِبَادِي كُلُّكُمْ ضَالٌّ إِلَّا مَنْ هَدَيْتُهُ فَاسْتَهْدُونِي أَهْدِكُم"ْ

)صحيح مسلم، حديث (2577

"اے میرے بندو! تم سب کے سب گمراہ ہو مگر جسے میں ہدایت دوں۔ پس مجھ سے ہدایت مانگو، میں تمہیں ہدایت دوں گا"۔

نماز اور ہدایت کی دعا

رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

" < إِنَّ بَيْنَ الرَّجُلِ وَبَيْنَ الشِّرْكِ وَالْكُفْرِ

تَرْكَ الصَّلَاةِ"ِ◌

(صحیح مسلم، حدیث 82)

یعنی "آدمی اور کفر کے درمیان فرق ہدایت کی دعا کا ترک ہے"۔

شارحین نے اس کا ترجمہ "نماز" کیا ہے لیکن یہ "تفسیر بالمثال" ہے، اصل مراد ہدایت کی دعا ہے کیونکہ نماز دراصل ہدایت کی دعا پر مشتمل ہے، جیسا کہ سورۃ الفاتحہ کی مرکزی دعا ہے: "اهدِنَا الصِّرَاطَ المُستَقِيمَ"۔ اسی لیے مدثر کی آیات میں بھی "لم نک من

المصلین" کا حقیقی مطلب یہ ہے کہ وہ

ہدایت کی دعا سے غافل رہے۔

نتیجہ

کافر کا شیوہ یہ ہے کہ وہ زندگی بھر کبھی

بھی ہدایت کی دعا نہیں کرتا۔

اس کے برعکس، مومن کی خصلت یہ ہے کہ
وہ مرتے دم تک ہدایت کا طلبگار رہتا ہے،
اور کم از کم زندگی میں ایک بار ضرور
اللہ سے ہدایت مانگتا ہے۔

رسول اللہ ﷺ اکثر یہ دعا فرمایا کرتے
تھے:

" >يَا مُقَلِّبَ الْقُلُوبِ ثَبِّتْ قَلْبِي عَلَى
دِينِك"◌َ

"اے دلوں کے الٹنے پلٹنے والے! میرے دل کو
اپنے دین پر ثابت رکھ"۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے
عرض کیا: اللہ کے رسول! ہم آپ پر اور
آپ کی لائی ہوئی شریعت پر ایمان لا چکے
ہیں، پھر بھی کیا آپ کو ہمارے بارے میں
اندیشہ رہتا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

“ >ہاں، بے شک دل اللہ کی انگلیوں میں سے دو انگلیوں کے درمیان ہیں، جس طرح چاہتا ہے انہیں الٹتا پلٹتا رہتا ہے”.

)جامع الترمذی، حدیث 2140 — حسن(

واللہ تعالیٰ اعلم

مجاز اور اسنادِ مجازی

تمہید

زبان و بیان میں بعض اوقات الفاظ اپنے
حقیقی معنی میں استعمال نہیں ہوتے بلکہ
کسی دوسرے مفہوم کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔
یہی طریقہ مجاز کہلاتا ہے۔ اسلوبِ بلاغت
میں یہ نہایت اہم ہے کیونکہ یہ حقیقت کے
پسِ منظر کو واضح کرتا ہے اور انسان کو

ظاہر پرستی سے نکال کر حقیقت کی طرف متوجہ کرتا ہے۔

1.

مجاز کی تعریف

لغوی: مجاز عربی میں "گزرنے کی جگہ" یا "راستہ" کو کہتے ہیں۔

اصطلاحی: کسی لفظ یا جملے کا اپنے اصل (حقیقی) معنی سے ہٹ کر کسی اور معنی میں استعمال ہونا، بشرطیکہ دونوں کے درمیان کوئی تعلق یا قرینہ موجود ہو۔

"شیر آیا" → اگر اصل شیر مراد ہو تو یہ حقیقت ہے۔

"شیر آیا" → اگر بہادر آدمی مراد ہو تو یہ مجاز ہے (کیونکہ بہادری میں شیر اور آدمی میں مشابہت ہے۔)

2.

اسناد کا مطلب

اسناد کا مطلب ہے کسی فعل یا صفت کو
کسی چیز کی طرف منسوب کرنا۔

جیسے: "بارش برسی" ← یہاں فعل (برسنا)
کو بارش کی طرف منسوب کیا گیا۔

3■

اسنادِ مجازی (مجازِ عقلی)

جب کوئی فعل یا صفت اصل فاعل کی بجائے کسی اور طرف منسوب کی جائے۔

مثال: "کتاب بولتی ہے" → حقیقت میں کتاب نہیں بولتی، بلکہ اس کا مضمون بولتا ہے۔

حقیقت اور مجاز کا فرق

حقیقت: بظاہر جو ہے وہی حقیقت بھی ہے۔

مجاز: بظاہر کچھ دکھائی دیتا ہے مگر حقیقت میں کچھ اور ہوتا ہے۔

قرآن کریم سے مثالیں

■1 کسان کو اگانے والا کہنا

> أَفَرَأَيْتُم مَّا تَحْرُثُونَ، أَأَنتُمْ تَزْرَعُونَهُ أَمْ نَحْنُ الزَّارِعُونَ (الواقعہ 64-63) :

بظاہر کسان کو اگانے والا کہا جاتا ہے،

حالانکہ حقیقت میں اگانے والا اللہ ہے۔

■2 بتوں کو گمراہ کرنے والا کہنا

> رَبِّ إِنَّهُنَّ أَضْلَلْنَ كَثِيرًا مِّنَ النَّاسِ

(ابراہیم 36) :

حضرت ابراہیمؑ نے فرمایا: "اے رب! ان بتوں نے بہت لوگوں کو گمراہ کیا"۔

حقیقت میں بت کسی کو گمراہ نہیں کرتے، بلکہ لوگوں کا وہم اور شیطان کی بہکانا سبب ہے۔

اور اللہ بطورِ خالق، مالک اور عادل حقیقی سبب ہے۔

3. کتاب کو بولنے والا کہنا

> هَذَا كِتَابُنَا يَنطِقُ عَلَيْكُم بِالْحَقِّ

(الجاثیہ) 29 :

کتاب کو بولنے والا کہا گیا، حالانکہ حقیقت میں اس کا لکھا ہوا مضمون گواہی دیتا ہے۔

حقیقت اور مجاز کا تعلق

یہ تمام مثالیں بتاتی ہیں کہ مجاز کا حقیقت کے ساتھ گہرا تعلق ہے۔

اللہ تعالیٰ ہی حقیقی فاعل ہے، مگر اپنی قدرت کو ظاہر کرنے کے لئے مخلوق کو بظاہر ذریعہ بناتا ہے۔

لغوی معنی میں "مجاز" کا مطلب ہے: گزرنے کی جگہ یا راستہ۔

گویا اللہ کی قدرت بظاہر مخلوق کے راستے سے گزر کر ظاہر ہو جاتی ہے۔

اسی لحاظ سے تمام مخلوقات کی نسبت "اسنادِ مجازی" ہے۔

لہٰذا:

مخلوق کا رحم کرنا،

مدد کرنا،

سننا وغیرہ،

یہ سب حقیقت میں اللہ کی صفات اور
قدرت کی جھلک ہیں، اور مخلوق کی طرف
نسبت صرف مجازاً ہے۔

اسی سے "اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ" (تمام تعریفیں اللہ ہی
کے لئے ہیں) کی حقیقت بھی واضح ہو جاتی
ہے کہ کیوں ہر تعریف اور ہر کمال کا حقیقی
مستحق صرف اللہ تعالیٰ ہے۔

مخلوق کا وجود اور اس کی صفات ظاہر

ہوئیں—مخلوق مدد کرتی ہے، سنتی ہے—اور یہ

صفات نام کے اعتبار سے خالق کے لئے بھی

ہیں۔ اسی وجہ سے خالق اور مخلوق کے

درمیان فرق کی ضرورت پیش آئی، جسے مسئلہ

توحید و شرک کے نام سے جانا جاتا ہے۔

اس کی تفصیلی وضاحت میں نے اپنے مضمون

"الحمد للّٰہ" میں کی ہے۔

یہاں مختصر فرق یہ ہے:

1. کامل اور محدود

اللہ کی ہر صفت کامل اور لامحدود ہے، جبکہ مخلوق کی ہر صفت محدود ہے۔

مثال: اللہ کو ہر چیز پر کامل قدرت اور علم حاصل ہے، جبکہ انسان کا علم و قدرت محدود اور چند چیزوں تک ہے۔

2. مافوق الاسباب اور ماتحت الاسباب

اللہ کا فعل کسی بھی سبب کے بغیر بھی ظاہر ہو سکتا ہے، جبکہ مخلوق ہمیشہ اسباب کی پابند ہے۔

مثال: اللہ بغیر بارش کے بھی فصل اگا سکتا ہے، لیکن کسان اسباب (بیج اور پانی) کا سہارا لیتا ہے۔

3. مستقل اور غیر مستقل (ذاتی و عطائی)

اللہ کی صفات ذاتی اور مستقل ہیں، جبکہ مخلوق کی صفات عطا کی ہوئی اور غیر مستقل ہیں۔

مثال: اللہ کا علم و قدرت ہمیشہ سے ہے اور ذاتی ہے، جبکہ مخلوق کا علم و قدرت غیر مستقل اور عطائی ہے جو سراسر اللہ کی مشیت کے تابع ہے۔

چنانچہ مخلوق کی صفات محدود اور ماتحت الاسباب ہیں۔ اسی لئے جب مخلوق سے مدد

طلب کی جاتی ہے تو دلیل کی ضرورت پیش

آتی ہے کہ جو مدد طلب کی جا رہی ہے، آیا

وہ اس کے علم و قدرت کے دائرے میں ہے

بھی یا نہیں۔

مجاز کی کئی اقسام ہیں جن کی تفصیل اہلِ

علم نے اپنی کتبِ بلاغت میں بیان کی ہے۔

چونکہ ان سب کا ذکر یہاں مضمون کو طویل

بنا دے گا، اس لیے تفصیل کے لیے علماء کی

طرف رجوع کرے۔

بیوی کی اطاعت اور اسنادِ مجازی

اسلام میں عورت خاوند کی اطاعت کرتی ہے،

مگر یہ اطاعت اللہ کے حکم کی وجہ سے

ہے۔

حقیقت میں اصل تابعداری اللہ کی ہے۔

خاوند کی جائز حکم کی اطاعت مجازاً ہے،

حقیقتاً عورت اللہ کی اطاعت کرتی ہے۔

جیسا کہ قرآن میں فرمایا: إِنِ الْحُكْمُ إِلَّا لِلَّهِ

(یوسف(40 :

"حکم صرف اللہ ہی کا ہے۔ اللہ کے سوا

کوئی حاکم نہیں"۔

یہ ظاہر میں خاوند کی تابعداری ہے مگر

حقیقت میں اللہ کے حکم کی اطاعت ہے

→ اسنادِ مجازی۔

لیکن غیر مسلم یہاں اعتراض کرتے ہیں کہ

"اسلام نے عورت کو خاوند کا غلام بنایا

ہے"۔

مسئلہ یہ ہے کہ وہ حقیقت اور مجاز کا فرق

نہیں سمجھتے۔ وہ مجاز کو حقیقت سمجھ لیتے

ہیں۔ یہی مظہر پرستی ان کے گمراہ ہونے کی اصل وجہ ہے۔

غیر مسلموں کی غلط فہمیاں

غیر مسلم اکثر حقیقت اور مجاز کے فرق کو نہ سمجھنے کی وجہ سے گمراہی میں پڑ جاتے ہیں۔

وہ ہدایت کے لئے صرف تجربات، مشاہدات اور کامن سینس پر انحصار کرتے ہیں اور جو چیز بظاہر نظر آتی ہے، اسی کو حقیقت سمجھ لیتے ہیں۔

مثال کے طور پر: "پانی پیاس بجھاتا ہے" → یہ بات تجربے سے درست لگتی ہے، لیکن حقیقت میں پانی بذاتِ خود پیاس بجھانے والا نہیں، بلکہ اللہ نے اس میں یہ تاثیر رکھی ہے۔

اگر پانی خودبخود وجود میں آیا ہوتا تو پھر

اسے کامل قدرت والا ہونا چاہئے تھا اور ہر

چیز پر قادر ہونا چاہئے تھا۔ جب ایسا نہیں

ہے تو لازمی طور پر یہ سب ایک خالق کے

منظم نظام کے تحت چل رہا ہے۔

لیکن جب پانی کی کمزوری ان پر واضح ہو

جاتی ہے تو اپنے دل کو بہلانے اور حقیقت

سے آنکھیں چرانے کے لئے یہ کہہ دیتے ہیں

کہ "یہ نظام خودبخود چل رہا ہے" یا "دَھر

چلا رہا ہے"۔ اگر واقعی دَھر اس نظام کو

چلا رہا ہے تو پھر دَھر کو کامل علم و

قدرت والا تسلیم کرنا پڑے گا۔ اور یہی تو

ایک خالق کی صفات ہیں۔ یوں وہ خالق کو

مانے بغیر بھی حقیقت میں اس کی صفات

تسلیم کر رہے ہوتے ہیں، لیکن دھوکے اور

ضد میں پڑے رہتے ہیں۔

چنانچہ غیر مسلم "مجاز کو حقیقت سمجھ

کر" خالق کا انکار کرتے ہیں اور کہتے ہیں:

"یہ نظام خودبخود چل رہا ہے"۔ یہی مظہر پرستی انہیں کفر کی اندھیروں میں دھکیل دیتی ہے۔

نتیجہ

مجاز اور اسنادِ مجازی ہمیں یہ سکھاتے ہیں کہ بظاہر جو نظر آ رہا ہے، وہی حقیقت نہیں ہوتا۔

اصل حقیقت یہ ہے کہ کائنات کی تمام طاقتیں اور اسباب اللہ کے حکم کے تابع ہیں۔

اگر انسان صرف ظاہری مجاز کو حقیقت سمجھے گا تو گمراہی میں پڑے گا، اور اگر حقیقت کی طرف نظر کرے گا تو ایمان کی روشنی حاصل کرے گا۔

واللہ تعالیٰ اعلم

مسئلہ توحید و شرک

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ

سب تعریفیں (خاص) اللہ ہی کے لیے ہیں ۔

مخلوق اللّٰہ کی صفات اور تعریفوں کا مظہر ہے

۔ مثلاً مخلوق اللّٰہ کی صفتِ خالق کا مظہر

ہے۔ اس طرح مخلوق رحم کرتا ہے، ایک

دوسرے کی مدد کرتا ہے، سنتا ہے، وغیرہ اور

اللہ بھی سنتا ہے، رحم کرتا ہے، مدد کرتا

ہے۔ اب بات یہ ہے کہ حقیقی تعریف تو

خاص اللّٰہ ہی کے لئے ہے۔ مخلوق اللّٰہ کے

صفات کا مظہر ہے لیکن ان کا وجود اور

صفت تو وجود میں آگیا ۔ تو ہمیں

ضرورت پڑی کہ ہم خالق اور مخلوق میں

فرق کرے۔ اس فرق کو مسئلہ توحید و

شرک سے جانا جاتا ہے ۔

بریلویوں (اہل سنت) نے یہ فرق کیا کہ اللہ

کی ذات اور صفات ذاتی ہے اور مخلوق کی

صفات عطائی ہے۔

لیکن یہ فرق نا مکمل ہے کیونکہ اس فرق

و تعریف سے مکہ کے مشرکین بھی مشرک

نہیں ہے کیونکہ وہ بھی اللہ کو خالق مانتے

تھے اور اپنی معبودوں کو اللہ کا مخلوق (یعنی

عطائی) مانتے تھے، بلکہ بعض صرف شفعاء

مانتے تھے لیکن پھر بھی قرآن و حدیث نے

انہیں مشرک قرار دئیے -- اس فرق سے

صرف مجوس ہی مشرک قرار پاتے ہیں

کیونکہ وہ دو خالق مانتے ہیں ، خالق خیر

اور خالق شر۔

"اور اگر تم ان (مشرکین) سے پوچھو آسمان

اور زمین کس نے بنائے تو ضرور کہیں گے

اللہ نے۔" (الزمر) 38 -

اس طرح کی آیات بہت ہیں ۔

صحیح مسلم کی روایت میں بھی یہی ملتا ہے

کہ وہ اپنے معبودوں کو عطائی مانتے تھے ۔

حضرت عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے

، کہا : مشرکین کہا کرتے تھے : (اے اللہ)

ہم حاضر ہیں ، تیرا کوئی شریک نہیں ۔

کہا : تو رسول اللہ ﷺ فرماتے :" تمھاری

بربادی ! بس کرو بس کرو (یہیں پر رک

جاؤ ۔) " مگر وہ آگے کہتے :" مگر

ایک ہے شریک جو تمھارا ہے ، تم اس کے

مالک ہو ، وہ مالک نہیں ۔" وہ لوگ بیت

اللہ کا طواف کرتے ہوئے یہی کہتے تھے ۔

صحیح مسلم 2815 -

لہذا یہ فرق نا مکمل ہے ۔

خالق اور مخلوق میں فرق مندرجہ ذیل ہیں ۔

1) کامل اور محدود:

اللّٰہ کے صفات کامل ہے اور مخلوق کے محدود

۔

مثلاً

اللّٰہ کا علم مکمل ہے ۔ اور مخلوق کا علم

محدود ہے ۔

مخلوق کو علم غیب کلی ثابت کرنا شرک ہے

۔

تقدیر اللّٰہ کے کامل علم اور کامل قدرت،

فضل و عدل کا مظہر ہے ۔

صفت 'رحمن' کا مظہر تمام مخلوقات کو

شامل ہے جو کمال کا معنیٰ رکھتا ہے اس لئے

مخلوق رحمن نہیں ہو سکتا اور منع فرمایا ہے

مخلوق کا نام رحمن رکھنا ۔

حدیث میں ہے،

"ایک چڑیا آئی اور کشتی کے کنارے پر بیٹھ گئی، پھر سمندر میں اس نے ایک یا دو چونچیں ماریں (اسے دیکھ کر) خضر (علیہ السلام) بولے کہ اے موسیٰ! میرے اور تمہارے علم نے اللہ کے علم میں سے اتنا ہی کم کیا ہوگا جتنا اس چڑیا نے سمندر (کے پانی) سے" صحیح بخاری 122 -

2) مافوق الاسباب اور ماتحت الاسباب:

اللہ اسباب کا محتاج نہیں ہے جبکہ مخلوق کی

صفات اسباب پر منحصر ہیں ۔

اللہ قرآن میں فرماتا ہے

"وہ بلا مثال کے پیدا فرمانے والا ہے، اور

جب فیصلہ فرمائے کسی امر کا تو بس یوں

فرما دیتا ہے کہ ہوجا، پس ہوجاتا ہے۔" البقرہ

117 ۔

پیغمبر محدود علمِ غیب وحی اور معجزہ (خاص

اسباب) کے ذریعے حاصل کرتا ہے ۔ لیکن یہ

وحی اور معجزہ نبی کے مجازی اختیار میں

بھی نہیں ہوتا کہ جب چاہے معجزہ کا استعمال

کرکے کسی بھی علم تک رسائی حاصل کرے

بلکہ اللہ جب چاہے بعض غیبی علم وحی اور

معجزہ کے ذریعے دیتا ہے ۔ (بعض علم پورا

نہیں کیونکہ پہلی فرق کے مطابق کامل علم

مخلوق کے لئے ثابت کرنا شرک ہے) (اگر یہ

معجزہ نبی کے مجازی اختیار میں ہوتا تو نبی

اس معجزہ کا استعمال کرکے تمام معلومات

تک پہنچ پاتا اور اس کا علم کامل ہو جاتا

جو کہ پہلی فرق کے مطابق شرک ہے۔)

(   )3 مستقل (ذاتی و عطائی:

وَمَا تَشَآءُوۡنَ اِلَّاۤ اَنۡ يَّشَآءَ اللّٰهُ رَبُّ

الۡعٰلَمِيۡنَ۝

ترجمہ: تکویر 29 -

اور تم کچھ نہیں چاہ سکتے مگر وہی جو

خدائے رب العلمین چاہے۔

اللّٰہ کی ذات اور صفات ذاتی ، ہمیشہ اور

آزاد ہے ۔

جبکہ مخلوق مستقل نہیں بلکہ اللہ کی مشیت

اور ارادہ کے ما تحت ہے ۔ مخلوق اپنی

اختیار میں مکمل طور پر آزاد نہیں ہے ۔

مثلاً دوائی میں شفا جب اللہ چاہے ڈال دے

جب چاہے روک لے۔ مخلوق ایک دوسرے کی

مدد (اسباب کے دائرے میں) اللہ کی مشیت

اور ارادہ کے ماتحت کر سکتے ہیں ۔

قبر سٹیج والے ہماری پکار سے قیامت تک

غافل ہیں (احقاف – 5) تو مدد کیسے کریں

گے ۔ اور دوسری بات دلیل بھی پیش کرنا

ضروری ہے کہ قبر سٹیج والے کونسا سبب

استعمال کرتے ہیں مدد کرنے کے لئے کیونکہ

مافوق الاسباب سننا، مدد کرنا، وغیرہ اللّٰہ کی

خاصیت ہے ۔

اور یہ جاننا بھی ضروری ہے کہ جس کے لیے

مخلوق کو پکارا جا رہا ہے، وہ معاملہ اس کے

علم اور قدرت کے دائرے میں آتا بھی ہے یا

نہیں۔

اللّٰہ اپنے فیصلے میں مکمل طور پر آزاد ہے ۔

کسی کی سفارش سے مجبور نہیں ہوتا بلکہ

اللّٰہ اپنے فضل و عدل سے فیصلہ کرتا ہے ۔

نتیجتاً ہم اللّٰہ کے فیصلے کے سامنے انتہائی

درجے کے عاجز اور بے بس ہیں یعنی اللّٰہ کے

سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں ۔

نوٹ: اس تیسرے قسم کے فرق میں تقدیر

تک بات پہنچ جاتی ہے ۔ میں نے تقدیر پر

پہلے دو پوسٹ کئے ہیں ۔

نوٹ: پہلی دو تقسیم میں ذاتی اور عطائی کی

درجہ بندی نامناسب ہے۔

مخلوق کی صفات نہ تو مطلق یا کامل معنوں

میں ذاتی ہیں اور نہ ہی عطائی۔

اسی طرح، مخلوق کی صفات اس انداز میں

بھی نہ تو ذاتی ہیں اور نہ ہی عطائی کہ وہ

مافوق الاسباب ہو جائیں۔

خلاصہ: مخلوق کی صفات عطائی بھی ہیں اور محدود اور ماتحت الاسباب بھی ہیں ۔

محدود اور ماتحت الاسباب کی وجہ سے دلیل کی ضرورت بھی پیش آتی ہے ۔

لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللہ کے اظہار کے طریقے انبیاء علیہم السلام پر فرشتہ کے ذریعے نازل کئے گئے ہیں جن کا سلسلہ محمد ﷺ پر مکمل ہو چکا ہے۔ اب قرآن و حدیث قیامت تک اللہ

کے تشریعی احکامات ہیں اور لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللہ

کے اظہار کے طریقے ہیں ۔ قرآن مجید خود

ایک معجزہ ہے جسے طالب حق مطالعہ کرکے

معلوم کر سکتا ہے کہ یہ قرآن مخلوق کی

پیداوار نہیں ہے اس لئے مزید انبیاء اور رسل

کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ انبیاء علیہم السلام

اللہ کی تشریعی احکامات لوگوں تک پہنچانے

کے لئے معجزات دیکھاتے تھے تاکہ لوگ یقین

کرے کہ یہ احکامات اللہ کی طرف سے ہیں

▪

قرآن و حدیث میں دلیل کی اہمیت پر بہت

زور دیا گیا ہے ۔ خود سے ایجاد کردہ لَآ اِلٰہَ

اِلَّا اللّٰہ کے اظہار کے طریقے اللّٰہ کو منظور

نہیں ہے ۔

نوٹ:

اللّٰہ کے مقابلے میں تمام مخلوقات اسنادِ مجازی

ہیں ۔

مثلاً:

مخلوق اسباب کے دائرے میں ایک دوسرے کی

مدد کرتا ہے تو یہ مدد مخلوق کی نسبت

اسناد مجازی ہے حقیقی مدد گار اللّٰہ ہے۔ اللّٰہ

نے سارا تدبیر کیا ہوا ہوتا ہے، اللّٰہ کا فیصلہ

اٹل ہے۔ جب مخلوق سے اسباب کے دائرے

میں مدد طلب کرنا ہو تو یہ نظریہ ہو کہ

اللہ حقیقی مدد گار ہے اگر اللہ میری مدد کا

فیصلہ کرے تب یہ مخلوق اسباب کے دائرے

میں میری مدد کر سکتا ہے، اس طرح یہ

مدد طلب کرنا مخلوق سے مجازاً ہے اور

حقیقت میں اللہ سے ہے اور مدد طلب کرنے

سے پہلے شرعی دلیل کا ہونا ضروری ہے۔ جیسے

کہ قبر سٹیج والے کونسا سبب استعمال کرتے

ہیں وغیرہ ۔ شرعی دلیل کی تین اقسام میں

نے پہلے ہی پوسٹ کئے ہیں اپنی کتاب میں

وہ ملاحظہ فرمائیں ۔

تقدیر کے استعمال کے مطابق جب مخلوق کا

شرعی شکریہ (نہ کہ اپنی خواہش کے مطابق

شکریہ) ادا کیا جائے تو یہ شکریہ مجازی ہے

حقیقی شکریہ اللہ کا ادا ہوتا ہے ۔ حدیث

مفہوم ہے "جو لوگوں کا (شریعت کے مطابق)

شکریہ ادا نہیں کرتا وہ اللّٰہ کا شکریہ ادا

نہیں کرتا۔"

مخلوق کو اللہ اس مدد پر اپنے فضل سے

اجر دیتا ہے ۔ مدد کرنے والا مخلوق تقدیر

کے استعمال کے مطابق خود کو خوش قسمت

سمجھ کر اللہ کا شکریہ ادا کرے کہ اللہ نے

اسے کسی کی مدد کرنے کا ذریعہ بنایا اور

اجر و خیر عطا کیا ۔

نوٹ:

اللّٰہ کی ذات اور صفات ہماری تصور سے باہر

ہے اور ہم مخلوق اللّٰہ کی حقیقت پر احاطہ

نہیں کر سکتے۔

مثلاً:

انسان کا کان ہے اس کو مبدأ کہتے ہیں ۔

آواز آ کر کان سے ٹکراتی ہے ۔ اس کو

کیفیت کہتے ہیں ۔

آواز سے باخبر ہو جاتا ہے ۔ اس کو نتیجہ

کہتے ہیں ۔

ہم انسان کے بارے میں یہ تینوں جانتے ہیں

جبکہ اللہ کے بارے میں مبدأ اور کیفیت

نہیں جانتے صرف نتیجہ جانتے ہیں کہ اللہ

ہماری پکار اور آواز سے باخبر ہے۔

ہم اللہ کی بقدرِ ضرورت معرفت حاصل کرنے

کی شرعی پابند ہیں اور وہ اتنا کہ عبادت

کے مفہوم کو سمجھتے ہوئے اس نتیجے پر

پہنچ جائے کہ اللہ کے فیصلے کے سامنے ہم

انتہائی درجے کے عاجز اور بے بس ہیں

نتیجتاً اللہ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں

ہے ۔ اتنی معرفت الہٰی اللّٰہ کو منظور ہے۔

اب اسی معرفت الہٰی یعنی لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللہ کے

اظہار کے طریقے قرآن و حدیث میں مذکور

ہیں ان کے مطابق اظہار کرے۔

انسان کی فطرت میں ہی خود غرضی اور

حرص شامل ہیں ۔ انسان اپنی خیر و

بھلائی کے بارے میں بڑا حریص ہے۔ یہ

فطرت مطلق نقصان دہ نہیں ہے جب اس

فطرت کے ساتھ جہالت (معرفت الہٰی میں

کوتاہی/شرک) شامل ہو جائے تو یہ نقصان دہ

ہے اور جب توحید شامل ہو جائے تو یہی

فطرت فائدے میں بدل جاتی ہے ۔ اپنی

فطرت سے مجبور ہو کر بھی اللّٰہ کی طرف

دوڑے گا۔

واللہ تعالیٰ اعلم

عقیدہ تفویض

یہ ایک ایسا باطل عقیدہ ہے جس میں یہ
مانا جاتا ہے کہ اللّٰہ تعالیٰ نے بعض اختیارات
اور معاملات خاص مخلوق (مثلاً عیسیٰ، محمد
ﷺ ، علی رضی اللہ عنہ وغیرہ) کو دے دئیے ہیں
اور وہ اللّٰہ کے حکم سے کائنات کی تدبیر
اور نظام چلاتا ہے ۔

اس نظریے کا سب سے بڑا نقصان یہ ہے کہ
اللّٰہ سے امیدیں اور نظریں ہٹ کر مخلوق پر

ہو جاتی ہے جو کہ اللہ کو منظور نہیں ۔

مومن خود کو اکیلے اللّٰہ کا محتاج سمجھ لے

اور اللّٰہ پر بھروسہ رکھے۔

مسئلہ توحید و شرک میں خالق اور مخلوق

میں فرق کیا گیا ہے ۔ کامل و محدود ،

مافوق الاسباب اور ماتحت الاسباب ، مستقل

اور غیر مستقل ۔

قرآن و حدیث نے دلیل کی اہمیت پر بہت

زور دیا ہے ۔ میں نے شرعی دلیل کی تین

اقسام پر پہلے سے ہی پوسٹ کیا ہوا ہے ۔

اگر کسی مخلوق کے بارے مجازی اختیار مانا

جائے جو محدود ہو، اسباب کے دائرے میں

ہو اور اللہ کے اختیار میں ہو کہ جب چاہے

اللہ اس سے اختیار لے لے۔ تب بھی شرعی

دلیل کا ہونا ضروری ہے کہ کون کون سے

مجازی اختیارات دئیے ہیں کیونکہ کامل

اختیارات شرک ہے ، اور کون کون سے اسباب

استعمال کرتے ہیں ۔ یہ دلائل نہ ہو تو یہ

بدعت کے زمرے میں آتا ہے ۔ جس نے

جان بوجھ کر اللہ اور رسول پر جھوٹ باندھا

تو اس کا ٹھکانہ جہنم ہے۔

البتہ قرآن و حدیث میں قبر سٹیج میں رہنے

والے کے بارے میں اس کے برعکس دلائل

موجود ہیں کہ قبر سٹیج والے ہماری پکار سے

قیامت تک غافل ہیں ۔ الاحقاف 5 –

سننے کے لئے کونسا آلہ و سبب استعمال

کرتے ہیں اور مدد کرنے کے لئے کونسا آلہ

و سںبب استعمال کرتے ہیں ان کے لئے الگ

سے شرعی دلیل کا ہونا ضروری ہے ۔

بارش ستاروں کی گردش کے سبب ماننے پر

بھی شرعی دلیل نہیں ہے اس لئے منع فرمایا ہے

یوں کہنا۔۔۔

جن کے بارے میں شرعی دلیل ہو جیسے کہ

اس دنیا میں رہنے والوں کو محدود مجازی

اختیارات دئیے گئے ہیں جو اللّٰہ کے حکم اور

اختیار کے تابع ہے۔

مثلاً

دوائی میں شفا کی تاثیر ہے۔

اس کے بارے میں صحیح اور اسلامی نظریہ

یہی ہے کہ دوائی میں شفا محدود ہو، اور

مثلاً دوائی کو استعمال کرنا ہوتا ہے جو سبب

کہلاتا ہے اور اللّٰہ کے اختیار میں ہے جب

چاہے موثر بنائے جب چاہے شفا روک لے۔ اس

طرح امیدیں اور نظریں خالص اللہ کی طرف

ہوں گے اسی کو توکل اور بھروسہ کہتے ہیں

۔ دوائی کو محض شرعی دلیل کے ہوتے ہوئے

جائز وسیلہ سمجھتے ہیں جو حقیقت میں دوائی

صفر ہے ۔ (البتہ جذبات میں دوائی (مخلوق)

سے امیدیں اور خوف کا ہونا ممکن ہے کیونکہ

یہ بے اختیار آتے ہیں اور اس لئے یہ معاف

ہے(

ہر کام سے پہلے بسم اللّٰہ کا مطلب یہ ہے

کہ اللّٰہ کی مدد شامل ہو تب کام بن جائے

۔

حاصل اس پورے پوسٹ کا یہ ہوا کہ ایک

تو شرعی دلیل کا ہونا ضروری ہے اور دوسری

بات جو سب سے اہم ہے (عقلی اختیاری) توکل

صرف اللّٰہ پر۔

واضح رہے کہ جائز اسباب استعمال کرنا توکل

کے منافی نہیں ہے۔۔ جائز اسباب (جو شرعی

دلیل سے ثابت ہو) کو استعمال کرکے نتیجہ

اللّٰہ کے حوالے کرنا اور عقلی اختیاری امیدیں

خالص اللہ سے وابستہ کرنا توکل کہلاتا ہے ۔

البتہ اعلی درجے کی توکل بھی کی جا سکتی ہے

جیسے کہ ابراہیم علیہ السلام نے کی تھی۔

اس مضمون کو قرآن و حدیث میں کئی جگہ

فرمایا گیا ہے کہ توکل خالص اللہ پر کرے۔

روایت ہے مفہوم: عکرمہ ﷛ بن ابو جہل

اور اس کے ساتھی کشتی میں سوار تھے جب

کشتی کو موجوں نے آگھیرا تو مشرکین کہنے

لگے اب ہمیں ہمارے معبود (مخلوق) نہیں بچا

سکتے صرف اللہ کو پکارو۔

عکرمہ ﷛ سوچنے لگے کہ اگر سمندر (مشکل)

میں ہمیں ہمارے معبود نہیں بچا سکتے صرف

اللہ بچاتا ہے تو خشکی میں بھی صرف اللہ
ہی کار ساز ہے۔ عکرمہ ﷛ ایمان لے آئے ۔

قرآن میں بھی یہی مضمون ہے کئی جگہ اللہ
فرماتا ہے مفہوم: کہ اے مشرکوں جب سمندر
کی موجوں میں یعنی مشکل میں خالص اللہ
کو پکارتے ہو اسی پر بھروسہ کرتے ہو تو
خشکی میں کیوں اللہ کو چھوڑ کر مخلوق پر
اعتماد اور بھروسہ کرتے ہو کیا خشکی میں

میں (اللّٰہ) تمھیں زمین میں نہیں دھنس

سکتا۔۔

مقصد یہ ہے کہ ہر حالت میں خالص اللّٰہ

سے امیدیں وابستہ رکھے۔

جس طرح مشکل میں تمہاری فطرت بیدار

ہوکر خالص اللہ کو پکارتی ہے ایسے ہی راحت

میں یعنی ہر حالت میں کرے۔

اس دنیا میں رہنے والے انسان سے مدد طلب

کرتے ہوئے بھی یہی نظریہ ہو کہ اللہ میری

مدد کا فیصلہ کرے تب یہ انسان اسباب کے

دائرے میں محدود کاموں میں میری مدد کر

سکے گا جو در حقیقت اللّٰہ سے امیدیں ہیں ۔

واضح رہے کہ یہاں بھی شرعی دلیل کا ہونا

ضروری ہے مدد طلب کرتے ہوئے ۔

خلاصہ:

اللّٰہ نے کسی کو کچھ حوالے نہیں کیا ہے۔

ساری حقیقی اور آزاد اختیارات اور تدابیر اللّٰہ

اکیلے کرتا ہے ۔ اللّٰہ کا فیصلہ اٹل ہے۔ اللّٰہ

کے فیصلے کے سامنے ہم تمام مخلوقات انتہائی

درجے کے عاجز اور بے بس ہے نتیجتاً اللہ کے

سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں ہے ۔

اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ (یوسف 40) -

ترجمہ: اٹل حکم و فیصلہ تو بس اللہ ہی

کا ہے۔

اِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ فِیْ

سِتَّةِ اَیَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ یُغْشِی الَّیْلَ

النَّهَارَ یَطْلُبُهٗ حَثِیْثًا ۙ وَّالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ وَالنُّجُوْمَ

مُسَخَّرٰتٍۭ بِاَمۡرِهٖ ؕ اَلَا لَهُ الۡخَلۡقُ وَالۡاَمۡرُ ؕ تَبٰرَكَ

اللّٰهُ رَبُّ الۡعٰلَمِيۡنَ۝ ◌َ

)الاعراف 54 -

ترجمہ:

بیشک تمہارا رب اللہ ہے جس نے آسمانوں

کو اور زمین کو چھ دن میں پیدا فرمایا۔

پھر عرش پر استواء فرمایا، ڈھانپ دیتا ہے

رات سے دن کو، رات اسے طلب کرلیتی ہے

جلدی سے، اور پیدا فرمایا چاند کو سورج کو

اور ستاروں کو اس حال میں کہ اس کے

حکم سے وہ مسخر ہیں خبر دار ! پیدا

فرمانا اور حکم دینا اللہ ہی کے لیے خاص ہے

برکت والا ہے وہ اللہ جو سارے جہانوں کا

رب ہے

ثُمَّ اسۡتَوٰی عَلَی الۡعَرۡشِ جیسا کہ اللّٰہ کی شان

کے مناسب استوی ہے ویسا استوی فرمایا ۔

اور نتیجتاً یہ کنایہ ہے اس بات سے کہ اللّٰہ

نے کسی کو کچھ حوالے نہیں کیا سب تدبیر

اللّٰہ خود کرتا ہے جیسے کہ آیت میں چند

تدابیر کا ذکر کرنے کے بعد عموماً فرمایا کہ

پیدا کرنا اور حکم کرنا اللّٰہ ہی کے لئے

خاص ہے۔ اور اللّٰہ رب العالمین برکت والا ہے

یعنی اللّٰہ کے اختیار میں خیر و بھلائی ہے۔

اللّٰہ سے مانگتے رہئے ۔ دعا مانگنے کے دو

طریقے ہیں ۔ اسمائے حسنیٰ کو وسیلہ میں

پیش کرکے مثلاً یا اللّٰہ یا الرحمن وغیرہ

اور

نیک عمل وسیلہ میں پیش کرکے مثلاً

ایمان ، نماز ، روزہ، تبلیغ ، جہاد، تجارت

، اچھی بات، اخلاق ، خدمت خلق وغیرہ ۔

ایمان کو وسیلہ میں پیش کرکے مغفرت اور

جنت الفردوس مانگا کرے۔

اللّٰہ سے لازوال اجر مانگا کرے کیونکہ اللّٰہ کی

شان عظیم ہے۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا

(مفہوم) تم جنت الفردوس مانگا کرو۔ کیونکہ

تم رب عظیم سے سوال کر رہے ہو۔ (دنیاوی

بادشاہ جیسے نہیں کہ محدود اجر و مزدوری

دے یہ بھی بڑی بات ہے)

والله تعالیٰ اعلم

مجازی شکریہ

نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

لَا يَشْكُرُ اللّٰهَ مَنْ لَا يَشْكُرُ النَّاسَ

ترجمہ: جو لوگوں کا (شریعت کے مطابق)(مجازی) شکر ادا نہیں کرتا تو اللّٰہ کا شکر ادا نہیں کرتا ۔

حوالہ: سنن ابو داؤد – 4811

مطلب یہ کہ

اللّٰہ پانی کے ذریعے پیاس بجھائے تو الحمد للّٰہ کہہ کر اللّٰہ کا شکر ادا کرے ۔ لیکن جب انسان کے ذریعے اللّٰہ تمھاری مدد کرے تو اللہ کا شکر ادا کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ انسان کا شریعت کے مطابق مجازی شکریہ ادا کرے تو یہ اللّٰہ کا شکریہ ادا ہو جائے گا اس مدد کا جو انسان کے ذریعے کیا گیا ۔

طریقہ کار یہ ہے ،

نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

"جو تمہارے ساتھ بھلائی کرے، تم اس کا بدلہ دو، اگر بدلہ دینے کے لیے کچھ نہ پاؤ تو اس کے لیے (اس قدر) دعا کرو یہاں تک کہ تمہیں لگے کہ تم نے بدلہ چکا دیا۔"

حوالہ: سنن ابو داؤد - 1672

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

جس پر کسی نے احسان کیا ہو تو اسے

چاہیے کہ وہ اس کا بدلہ اتارے

اگر بدلہ اتارنے کی طاقت نہ رکھے تو احسان

کرنے والے کا اچھے الفاظ میں ذکر کرے

مسند احمد 23496

نوٹ: واضح رہے کہ شریعت کے مطابق شکریہ

۔۔ مثلاً انسان کو بدلے میں سجدے کرنا

شریعت کے مطابق شکریہ نہیں ہے ۔

واللہ تعالیٰ اعلم

عبادت کی تمام ممکنہ اقسام

لغت میں انتہائی درجے کی عاجزی اور بے بسی کا نام عبادت ہے۔ (مفردات القرآن)

مسئلہ توحید و شرک میں، میں نے خالق اور مخلوق کے درمیان تین بنیادی فرق تفصیل سے بیان کیے ہیں:

1. کامل اور محدود

2. مافوق الاسباب اور ماتحت الاسباب

3. مستقل اور غیر مستقل

عبادت کی تعریف:

ہر وہ قول، عمل، یا عقیدہ جو اس نظریہ کے ساتھ کیا جائے کہ جس کے لیے کیا جا رہا ہے، وہ:

کامل صفت رکھتا ہے (مثلاً غیر محدود علم، طاقت، یا قدرت رکھتا ہے)

اسباب کا محتاج نہیں (مثلاً بغیر کسی ذریعے کے مدد کر سکتا ہے، باخبر ہو سکتا ہے)

اپنے اختیار میں مستقل ہے (یعنی اللہ کے ارادے کے تابع نہیں)

تو یہ عبادت کہلائے گا۔

)یہ ضروری نہیں کہ تینوں وجوہات ایک ساتھ موجود ہوں، اگر ان میں سے کوئی ایک بھی ہو، تو وہ عمل عبادت میں شامل ہوگا(۔

مثالیں:

1. اگر کسی کو اس نظریے سے آواز دی جائے کہ وہ بغیر کسی ذریعے کے باخبر ہوتا ہے، تو یہ پکار عبادت ہے۔

2. اگر یہ عقیدہ رکھا جائے کہ کسی کا علم یا قدرت کامل ہے، تو یہ عقیدہ اس کی عبادت ہے۔

3. اگر کسی سے مدد اس عقیدے سے مانگی جائے کہ وہ بغیر اسباب کے مدد کر سکتا ہے، تو یہ مدد طلب کرنا عبادت کہلاتا ہے۔

4. اگر کسی کو اس نظریے سے مدد کے لیے پکارا جائے کہ وہ ہر وقت، ہر جگہ، اپنے اختیار سے مدد کر سکتا ہے، تو یہ عبادت ہے۔

5. اگر کسی مخلوق سے ظاہری اسباب میں رہ کر ڈرا جائے تو یہ خوف عبادت نہیں ہے

.

اگر کسی سے اس عقیدے کے ساتھ ڈرا جائے کہ اس کی کوئی صفت کامل اور مکمل ہے تو عبادت ہے۔

اگر کسی سے اس عقیدے کے ساتھ ڈرا جائے کہ بغیر کسی ظاہری سبب کے نقصان پہنچانے پر قادر ہے تو عبادت ہے۔

اگر کسی سے اس عقیدے کے ساتھ ڈرا جائے
کہ ذاتی طور پر نقصان دینے پر قادر ہے تو
عبادت ہے۔

پرانے مشرکین اور آج کے مشرکین میں فرق:

پہلے زمانے کے مشرکین اپنے عمل کو عبادت
اس لیے مانتے تھے کیونکہ وہ عبادت کی اصل
تعریف سے واقف تھے، اور وہ جانتے تھے کہ
غیر اللہ کو اس نظریے سے پکارنا عبادت میں
شامل ہے۔

لیکن آج کے مشرکین، جو خود کو مسلمان کہتے ہیں، وہ اپنے عمل کو عبادت کا نام نہیں دیتے، بلکہ "وسیلہ"، "استعانت"، اور "شفاعت" کے نام پر اس کا جواز پیش کرتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے مشرکین کے اس عقیدے کا رد کیا:

> وَيَعْبُدُونَ مِن دُونِ اللَّهِ مَا لَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنفَعُهُمْ وَيَقُولُونَ هَٰؤُلَاءِ شُفَعَاؤُنَا عِندَ اللَّهِ

(یونس) 18 :

"وہ اللہ کے سوا ان کی عبادت کرتے ہیں جو نہ انہیں نقصان پہنچا سکتے ہیں، نہ فائدہ، اور وہ کہتے ہیں کہ یہ اللہ کے نزدیک ہماری سفارش کرنے والے ہیں"۔

یہی عقیدہ آج قبروں، ولیوں، اور نبیوں سے مدد مانگنے والوں کا بھی ہے۔

کب مدد مانگنا عبادت نہیں؟

اگر کسی مخلوق کو مجازی مدد کے لیے اس طرح پکارا جائے کہ:

1. وہ محدود صفات رکھتا ہے (مثلاً ہر چیز پر قدرت نہیں رکھتا)

2. وہ ماتحت الاسباب ہے (مثلاً اسباب اور ذرائع کے ذریعے مدد کر سکتا ہے، اسباب کے ذریعے باخبر ہو سکتا ہے)

3. وہ غیر مستقل ہے (یعنی اللہ کے اذن کے بغیر کچھ نہیں کر سکتا)

تو یہ مدد مانگنا عبادت نہیں کہلائے گا۔ (واضح رہے کہ ان تینوں وجوہات کا ایک ساتھ ہونا ضروری ہے ۔ اگر ایک وجہ بھی اس کے بر خلاف ہو تو پھر عبادت ہی کہلائے گا)

"ایک ضروری شرط:

مخلوق سے مجازی مدد طلب کرتے وقت

کسی جائز سبب (ذریعہ) کا ثبوت ہونا ضروری

ہے، کیونکہ مخلوق اسباب کی محتاج ہے۔ لیکن

خالق سے مدد طلب کرنے کے لیے کسی ثبوت

کی ضرورت نہیں، کیونکہ اللّٰہ بغیر کسی سبب

کے مدد کر سکتا ہے—وہ صرف فرماتا ہے 'ہو

جا' اور وہ ہو جاتا ہے۔

دوسری بات، جب کسی مخلوق سے مجازی مدد

طلب کی جائے تو اس کی عادۃً استطاعت کو

مدنظر رکھا جاتا ہے، نہ کہ یہ حقیقت کہ

اللہ کی قدرت سے وہ کچھ بھی کر سکتی ہے۔

جبکہ اللّٰہ سے براہ راست دعا کرتے وقت اس

کی شان کے مطابق مانگنا چاہیے۔ ہر نعمت

ایسی مانگنی چاہیے جو اللہ کی رضا کا ذریعہ

بنے، یعنی بابرکت ہو، کیونکہ اللہ کی رضا سے

بڑھ کر کچھ نہیں۔

تیسری بات، اللّٰہ نے کسی کو کچھ حوالے

نہیں کیا اس لئے دعا براہ راست اللّٰہ سے

مانگے اور براہ راست عقلی امیدیں اللہ سے

وابستہ رکھے۔ واسطہ نہ بنائے ۔

اگر مخلوق سے مجازی مدد طلب کی جائے

اور اس کے لیے کوئی سبب ثابت نہ ہو،

لیکن مدد طلب کرنے والا یہ مانتا ہو کہ

مدد طلب کیا جانے والا بغیر اسباب کے مدد

نہیں کر سکتا اور نہ ہی باخبر ہو سکتا ہے،

تو یہ طلب بدعت کے زمرے میں آئے گی۔

اور اگر بے جا تاویل کرکے سبب پر دلیل

پیش کرے تو یہ بھی بدعت کے زمرے میں

آتا ہے اور خواہش پرستی کہلاتا ہے ۔

لیکن اگر مدد طلب کرنے والا مدد مانگے

جانے والے کو کامل صفت والا، یا مافوق

الاسباب تصرف رکھنے والا، یا مستقل سمجھتا

ہو، تو یہ عبادت کہلائے گی۔

اگر دلیل ہو تب بھی مخلوق سے مدد طلب

کرتے وقت عقلی اختیاری امیدیں اور نظریں

خالص اللہ سے وابستہ رکھنا کیونکہ یہ اللّٰہ

سے ہی براہِ راست مدد طلب کرنا ہے مخلوق

سے مجازاً ہے ۔

قبر میں رہنے والوں کو اسباب کے ذریعے

باخبر ہونے کا دعویٰ مندرجہ ذیل آیت کی

وجہ سے بدعت ہے۔

سورہ الأحقاف آیت 5 میں "قیامت تک جواب

نہ دینے" کی قید لگائی گئی ہے، جو قبر میں

رہنے والوں پر دلالت کرتی ہے۔ قریبی فرشتے

سنتے ہیں (صحیح مسلم 2732)، بت کبھی نہیں

سن سکتے، اور جنات اور انسان جو اس دنیا

میں ہو اگر قریب ہوں تو سن سکتے ہیں (یا

اسباب کے ذریعے)

اور اگر یہ کہا جائے کہ اللہ کی مشیت کے

بغیر جواب نہیں دے سکتے تو پھر قیامت

تک کی قید لگانے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ

اللہ کی مشیت کے بغیر ہمشہ جواب نہیں

دے سکتے ۔

لہذٰا یہ آیت خاص قبر میں رہنے والوں کے

بارے میں ہے۔

پچھلی شریعتوں میں تعظیم اور احترام کا ایسا سجدہ، جس میں کامل صفت، یا مافوق الاسباب تصرف، یا استقلال کا عقیدہ نہ ہو، عبادت کا سجدہ نہیں کہلاتا تھا، اس لیے مخلوق کے لیے جائز تھا، جیسا کہ آدم (علیہ السلام) اور یوسف (علیہ السلام) کو کیا گیا۔ لیکن شریعتِ محمدیہ میں متواتر احادیث کے ذریعے اسے حرام قرار دیا گیا ہے۔

تاہم، اگر سجدہ اس نیت سے کیا جائے کہ

مسجودِ کامل صفت والا ہے، یا اسباب کا

محتاج نہیں، یا مستقل ہے، تو یہ سجدہ

عبادت کا سجدہ کہلائے گا۔

نوٹ: اللّٰہ نے دلیل کی اہمیت پر زور دیا ہے

۔ خود سے ایجاد کردہ عبادت کے طریقے اللّٰہ

کو منظور نہیں ہے ، عبادت کے وہ طریقے

منظور ہے جو قرآن و حدیث سے ثابت ہے ۔

نوٹ: عبادت کا لغوی اور اصطلاحی دونوں معنی مفید ہیں۔ اللہ کی معرفت کے لیے لغوی معنی کو بنیاد بنایا جائے، جبکہ یہ سمجھنے کے لیے کہ کون سا قول، فعل یا نظریہ عبادت کے دائرے میں آتا ہے اور کون سا نہیں، اصطلاحی معنی کو معیار بنایا جائے۔

مثلاً:

اللّٰہ کے فیصلے کے سامنے ہم انتہائی درجے کے عاجز اور بے بس ہیں نتیجتاً اللّٰہ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں ہے ۔

واللہ تعالیٰ اعلم۔

عبادت: قرآن و حدیث کی روشنی میں

قرآن مجید میں اللّٰہ تعالیٰ عبادت کے اثبات اور نفی کے لئے دو چیزیں دلیل میں پیش کرتا ہے ۔

1) تصرف و قدرت

2) علم غیب

ذیل میں قرآن کی آیات ہے اللّٰہ اپنے لئے عبادت ثابت کرتا ہے تو علم غیب و تصرف کی دلیل پیش کرتا ہے ۔ اور مخلوق سے عبادت نفی کرتا ہے تو علم غیب اور مافوق الاسباب تصرف کی نفی کرتا ہے ۔

1)

اِنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ قَدِیۡرٌ (تصرف)

ترجمہ: (سورۃ البقرہ 20) –

بیشک اللہ تعالٰی ہر چیز پر قادر ہے۔

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِىْ خَلَقَكُمْ وَالَّذِيْنَ

مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ۙ ۞ (عبادت)

ترجمہ: (سورۃ البقرہ 21) -

اے لوگو ! عبادت کرو اپنے رب کی جس نے

تم کو پیدا فرمایا اور ان لوگوں کو بھی پیدا

فرمایا جو تم سے پہلے تھے تاکہ تم پرہیزگار

بن جاؤ۔

اسی رکوع کے آخر میں ارشاد ہے

وَهُوَ بِكُلِّ شَىْءٍ عَلِيْمٌ ۞ (علم غیب)

ترجمہ: (سورۃ البقرہ 29) -

اور وہ ہر چیز کا جاننے والا ہے۔

----

2)

سورۃ البقرہ آیت نمبر 255 آیت الکرسی

اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ (عبادت)

لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ (تصرف)

يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ (علم غیب)

3

إِنَّ اللّٰهَ لَا يَخْفٰى عَلَيْهِ شَىْءٌ فِى الْاَرْضِ وَلَا فِى السَّمَآءِ ۞ (علم غیب)

ترجمہ: (آل عمران 5) -

بیشک اللہ ایسا ہے کہ اس پر کوئی چیز

پوشیدہ نہیں زمین میں اور نہ آسمان میں

هُوَ الَّذِىۡ يُصَوِّرُكُمۡ فِى الۡاَرۡحَامِ كَيۡفَ يَشَآءُ ‌ؕ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الۡعَزِيۡزُ الۡحَكِيۡمُ ۞ (تصرف اور عبادت)

ترجمہ: (آل عمران 6) -

اللہ وہ ہے جو تمہاری تصویریں بناتا ہے رحموں میں جس طرح چاہے کوئی معبود نہیں اس کے سوا۔ وہ غلبہ والا ہے، حکمت والا ہے۔

---

4)

قُلْ اَ تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ (عبادت کی نفی

مخلوق سے)

مَا لَا يَمْلِكُ لَكُمْ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا ؕ (نفی

تصرف)

وَاللّٰهُ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۞ (علم غیب)

ترجمہ: (المائدہ 76) -

آپ فرما دیجئے کیا تم اللہ کو چھوڑ کر ان

کی عبادت کرتے ہو جو تمہارے ضرر اور نفع

کا اختیار نہیں رکھتے اور اللہ سننے والا اور

جاننے والا ہے۔

---

5)

وَهُوَ اللّٰهُ فِي السَّمٰوٰتِ وَفِي الْاَرْضِ ۚ يَعْلَمُ سِرَّكُمْ

وَ جَهْرَكُمْ وَيَعْلَمُ مَا تَكْسِبُوْنَ ۞ (علم غیب)

ترجمہ: (الانعام 3) -

اور وہ اللہ ہے آسمانوں اور زمین میں، وہ

جانتا ہے تمہارے باطنی حالات کو اور ظاہر

حالت کو، اور وہ جانتا ہے جو تم عمل

کرتے ہو۔

وَاِنۡ يَّمۡسَسۡكَ اللّٰهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهٗۤ اِلَّا هُوَ‌ؕ

وَاِنۡ يَّمۡسَسۡكَ بِخَيۡرٍ فَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَىۡءٍ قَدِيۡرٌ ۞

(تصرف و قدرت)

ترجمہ: (الانعام 17) -

اور اگر اللہ تجھے کوئی تکلیف پہنچا دے تو

اس تکلیف کا دور کرنے والا اس کے علاوہ

کوئی نہیں۔ اور اگر وہ تجھے کوئی بھلائی

پہنچا دے تو وہ ہر چیز پر قادر ہے۔

اِنَّمَا هُوَ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ (نتیجتاً عبادت)

ترجمہ: (الانعام 19) -

کہ صرف وہی ایک معبود ہے۔

---

6)

بَدِيۡعُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ‌ؕ اَنّٰى يَكُوۡنُ لَهٗ وَلَدٌ وَّلَمۡ تَكُنۡ لَّهٗ صَاحِبَةٌ‌ ؕ وَخَلَقَ كُلَّ شَىۡءٍ‌ ۚ وَهُوَ بِكُلِّ شَىۡءٍ عَلِيۡمٌ ۞ (تصرف اور علم غیب)

ترجمہ: (الانعام) 101 -

وہ آسمانوں کا اور زمین کا بےمثال پیدا فرمانے والا ہے کہاں ہوسکتی ہے اس کی اولاد حالانکہ اس کی بیوی نہیں ہے، اور اس نے پیدا فرمایا ہر چیز کو اور وہ ہر چیز کو جاننے والا ہے،

ذٰ لِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَۚ خَالِقُ كُلِّ

شَيْءٍ فَاعْبُدُوْهُۚ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ وَّكِيْلٌ ۞

(عبادت اور تصرف)

ترجمہ: (الانعام (102 -

یہ اللہ تمہارا رب ہے۔ اس کے سوا کوئی

معبود نہیں وہ ہر چیز کا پیدا فرمانے والا ہے

سو تم اسی کی عبادت کرو اور وہ ہر چیز کا

نگہبان ہے۔

(7

ذیل میں (النحل میں) مخلوق سے عبادت

نفی کرنے کے لئے دلیل میں تصرف اور علم

غیب کی نفی کی گئی ہے ،

وَاللّٰہُ یَعۡلَمُ مَا تُسِرُّوۡنَ وَ مَا تُعۡلِنُوۡنَ ۞ (علم

غیب)

ترجمہ: (النحل) 19 -

اور اللہ جانتا ہے جو تم چھپاتے ہو اور جو

ظاہر کرتے ہو

وَالَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَا يَخْلُقُوْنَ شَيْـًٔا

وَّهُمْ يُخْلَقُوْنَؕ ۞ (نفی تصرف)

ترجمہ: (النحل) 20 -

اور جو لوگ اللہ کو چھوڑ کر غیروں کو

پکارتے ہیں وہ کوئی چیز بھی پیدا نہیں کرتے

اور وہ پیدا کیے جاتے ہیں۔

اَمْوَاتٌ غَيْرُ اَحْيَآءٍ ۚ وَمَا يَشْعُرُوْنَ اَيَّانَ يُبْعَثُوْنَ

۞ (نفی علم غیب)

ترجمہ: (النحل) 21 -

بےجان ہیں زندہ نہیں ہیں، اور انہیں خبر

نہیں ہے کہ کب اٹھائے جائیں گے۔

اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ (نتیجتاً عبادت)

ترجمہ: (النحل (22 -

تمہارا معبود ایک ہی معبود ہے،

(8

النمل آیت نمبر 60 سے 64 تک تصرف اور

عبادت

النمل آیت 65 میں علم غیب

النمل آیت نمبر 91 میں نتیجتاً عبادت کا حکم

---

9)

وَرَبُّكَ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ وَيَخْتَارُ (تصرف)

ترجمہ: (القصص) 68 -

اور آپ کا رب جسے چاہتا ہے پیدا فرماتا ہے

اور جسے چاہتا ہے چن لیتا ہے۔

وَرَبُّكَ يَعۡلَمُ مَا تُكِنُّ صُدُوۡرُهُمۡ وَمَا يُعۡلِنُوۡنَ ۞

(علم غیب)

ترجمہ: (القصص 69) -

اور آپ کا رب جانتا ہے جسے ان کے سینے

چھپاتے ہیں اور جسے یہ لوگ ظاہر کرتے

ہیں

وَهُوَ اللّٰهُ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ‌ؕ (عبادت)

ترجمہ: (القصص 70) -

اور اللہ وہی ہے اس کے سوا کوئی معبود نہیں

10

لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا

وَمَا تَحْتَ الثَّرٰى ۞ (تصرف)

ترجمہ: (طٰہ) 6 -

اسی کے لیے ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور

جو زمین میں ہے اور جو ان کے درمیان ہے

اور جو تحت الثریٰ ہے

وَاِنْ تَجْهَرْ بِالْقَوْلِ فَاِنَّهٗ يَعْلَمُ السِّرَّ وَاَخْفٰى ۞

(علم غیب)

ترجمہ: (طٰہ (7 -

اور اگر آپ زور سے بات کریں تو بلاشبہ وہ

چپکے سے کہی ہوئی بات کو جانتا ہے اور اس

بات کو بھی جو اس سے زیادہ خفی ہو

اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ؕ (نتیجتاً عبادت)

ترجمہ: (طٰہ (8 -

اللہ ایسا ہے کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں

(11

ذیل میں صرف علم غیب کو عبادت کی علت

قرار دیا ہے ۔

وَلِلّٰهِ غَيْبُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاِلَيْهِ يُرْجَعُ الْاَمْرُ

كُلُّهٗ فَاعْبُدْهُ وَتَوَكَّلْ عَلَيْهِ‌ؕ وَمَا رَبُّكَ بِغَافِلٍ عَمَّا

تَعْمَلُوْنَ ۝

ترجمہ: (ھود (123 ۔

اور اللہ ہی کیلئے ہے آسمان کی اور زمین کی

غیب کی چیزوں کا علم۔ اور اسی کی طرف

تمام امور جمع ہوں گے۔ سو آپ اس کی

عبادت کریں اور اس پر توکل کریں اور آپ

کا رب ان کاموں سے غافل نہیں جو تم

کرتے ہو۔

خلاصہ:

صحیح مسلم - 2815 میں ہے:

مشرکین کہتے تھے

تَمْلِكُهُ وَمَا مَلَكَ

ترجمہ: تم (اللہ) اس (ہمارے معبود) کے

مالک و اختیار مند ہو ، وہ (خود) مالک

نہیں ۔

مشرکین اپنے معبودوں کو اللہ کی مخلوق و

مملوک سمجھتے تھے اس لئے ذاتی اور عطائی

کی تقسیم یہاں عبادت کے اس قسم میں

مناسب نہیں ہے ۔ بلکہ مناسب اور حق یہ

ہے کہ مشرکین اپنے معبودوں کو عطائی ہی

مانتے تھے لیکن بغیر ظاہری سبب کے تصرف

اور باخبر ہونے کا عقیدہ رکھتے تھے۔ کہتے

تھے بس اللہ کی قدرت سے کرتے ہیں ۔

ظاہری سبب معلوم نہ ہوتا تھا اور نہ ہی

سبب پر واضح اور مناسب دلیل تھا جیسا کہ

تَمْلِكُهُ وَمَا مَلَكَ سے ظاہر ہوتا ہے ۔

اور قرآن میں ارشاد ہے

لَا بُرْهَانَ لَهٗ بِهٖ ۙ

ترجمہ: جس کی اس کے پاس کوئی دلیل

نہیں ہے۔

دلیل سے مراد

دلیل ھدیٰ (قرآن و حدیث)

یا

دلیل بدیہی

دلیل ھدیٰ غالب ہے دلیل بدیہی پر۔

اس لئے عبادت کی تعریف مذکورہ بالا آیات

سے یوں لی جاتی ہے ۔

ہر وہ نظریہ ، قول اور فعل جو اس نیت

اور عقیدہ سے کی جائے کہ جس کے لئے کی

جائے وہ بغیر ظاہری اسباب کے نفع و نقصان

پر قادر ہے اور بغیر ظاہری اسباب کے خبر

دار ہوتا ہے عبادت کہلاتا ہے ۔ (چاہے اس کو

کوئی بھی نام رکھ لے مگر اس عقیدے کے

ساتھ عبادت ہی کہلائے گا ۔ وجہ یہ ہے کہ

غیبی تسلط و تصرف اور علم غیب تسلیم کر

کے مدد مانگی جاتی ہے جو کہ الوہیت کے لئے

علت ہیں)۔

(نوٹ: یہ عبادت کے معنی کا جزو ہے یعنی

عبادت کی ایک قسم ہے۔

عبادت کی تمام اقسام پر پہلے ہی پوسٹ کر

چکا ہوں(

مثال:

زندہ انسان کی ظاہری چال ایک نمایاں سبب

ہے، جس کی بنیاد پر کسی دوسرے زندہ

انسان سے مجازی پناہ طلب کی جا سکتی ہے۔

(یہ پناہ طلب کرنا عبادت نہیں ہے(

وجہ: زندہ انسان کو دوسرے زندہ انسان کی

ظاہری چال نظر آتی ہے ۔

جبکہ شیطان اور اس کی چالیں پوشیدہ اور غیبی امور میں سے ہیں، اسی لیے شیطان سے پناہ براہِ راست اللہ سے طلب کی جاتی ہے۔ (یہ پناہ طلب کرنا عبادت ہے)

وجہ: شیطان اور اس کی چال پوشیدہ اور غیب میں سے ہیں ۔

ظاہری دشمن کے ظاہری چال سے بچنے کا طریقہ:

خُذِ الْعَفْوَ وَأْمُرْ بِالْعُرْفِ وَأَعْرِضْ عَنِ

الْجٰهِلِيْنَ ۝

ترجمہ: (الاعراف 199) -

معاف کرنے کو اختیار کیجیے، اور نیک کاموں

کا حکم دیجیے اور جاہلوں سے کنارہ کیجیے

غیبی دشمن کے غیبی چال سے بچنے کا

طریقہ:

وَإِمَّا يَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطٰنِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ ۚ إِنَّهٗ

سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۝

ترجمہ: (الاعراف 200) -

اور اگر آپ کو شیطان کی طرف سے کوئی وسوسہ آنے لگے تو اللہ کی پناہ مانگ لیجیے (وجہ) بلاشبہ وہ (اللّٰہ بغیر ظاہری سبب کے) سننے والا جاننے والا ہے۔

شر کا مطلب پوشیدہ نقصان ہے، اسی لیے قرآن و حدیث میں شرور سے براہِ راست اللہ کی پناہ طلب کی گئی ہے۔

جیسا کہ سورۃ الفلق میں فرمایا:

قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِۙ(۱) مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ(۲)ۙ

"کہو: میں پناہ مانگتا ہوں صبح کے رب کی، ہر اُس چیز کے شر سے جو اُس نے پیدا کی۔" (الفلق 2-1) :

اسی طرح نبی کریم ﷺ مسنون دعاؤں میں مختلف شرور سے اللہ کی پناہ مانگا کرتے تھے، جیسا کہ حدیث میں ہے:

اَللّٰهُمَّ إِنِّي أَعُوذُ بِكَ مِنْ شَرِّ مَا عَمِلْتُ وَمِنْ شَرِّ مَا لَمْ أَعْمَلْ

"اے اللہ! میں تیرے پاس اپنے کیے ہوئے اعمال کے شر سے اور جو نہیں کیے ان کے شر سے پناہ مانگتا ہوں۔" (صحیح مسلم : 2716)

__________****_______________________________________**

____

عبادت کا معنی طاعت مطلقہ:

طاعتِ مطلقہ کا مفہوم

طاعتِ مطلقہ کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت ہر حال میں برحق اور مناسب ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کے تمام احکام حق، عدل اور حکمت پر مبنی ہوتے ہیں۔ مخلوق کا حکم اللّٰہ کے حکم کے تابع کیا جائے اگر اللّٰہ کے حکم کے موافق نہیں ہے تو باطل قرار دیا جائے ۔

اللہ تعالیٰ جس چیز کا حکم دیتا ہے، وہی

حقیقت میں نتیجہ خیز ہوتی ہے، یعنی اللہ نے

جس چیز کو حرام قرار دیا ہے، اس کا انجام

بھی ایسا ہی ہوگا، مگر اللہ کی مشیّت کے

مطابق۔

مثلاً:

چوری کو اللہ نے حرام کیا ہے، اس کا

مطلب یہ ہے کہ چوری کا انجام نقصان دہ

ہوگا، یعنی یہ برائی ہے اور اس کا نتیجہ برا

ہوگا، اگر اللہ چاہے تو۔

ایسا نہیں ہے کہ چوری سے کسی کے درجات

جنت میں بلند ہوں کیونکہ اللہ نے چوری کو

گناہ قرار دیا ہے، اور اس کا نتیجہ برا ہی

ہوگا۔ (اگر اللّٰہ معاف کرے تو الگ بات ہے۔)

یہی اصول تمام شرعی احکام پر لاگو ہوتا ہے

کہ اللہ جو حکم دیتا ہے، وہی حقیقت میں

موثر ہوتا ہے، نہ کہ انسان کی خواہشات یا

گمان۔ اس لیے اللہ کی اطاعت مطلق اور

برحق ہے، اور اسی میں فلاح ہے۔

عبادت، بمعنی طاعتِ مطلقہ، درج ذیل آیات

میں مذکور ہے۔

1)

يٰۤاَبَتِ لَا تَعۡبُدِ الشَّيۡطٰنَ‌ؕ اِنَّ الشَّيۡطٰنَ كَانَ

لِلرَّحۡمٰنِ عَصِيًّا ۞

ترجمہ: (مریم 44) -

اے میرے باپ تم شیطان کی پرستش نہ کرو، بلاشبہ شیطان رحمن کا نافرمان ہے۔

(شیطان کو کسی نے سجدہ وغیرہ نہیں کیا تھا ، یہاں عبادت سے مراد طاعت مطلقہ ہے)

---

2)

اَلَمۡ اَعۡهَدۡ اِلَيۡكُمۡ يٰبَنِىۡۤ اٰدَمَ اَنۡ لَّا تَعۡبُدُوا الشَّيۡطٰنَ‌ۚ اِنَّهٗ لَـكُمۡ عَدُوٌّ مُّبِيۡنٌ ۝ ۶۰ وَّاَنِ اعۡبُدُوۡنِىۡ‌ ؕ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسۡتَقِيۡمٌ ۝ ۶۱

ترجمہ: (یس 60-61) -

اے بنی آدم کیا میں نے تمہیں تاکید نہیں

کی تھی کہ شیطان کی عبادت مت کرنا،

بلاشبہ وہ تمہارا کھلا ہوا دشمن ہے۔

اور میری عبادت کرنا، یہ سیدھا راستہ ہے۔

(3

فَقَالُوْٓا اَنُؤْمِنُ لِبَشَرَيْنِ مِثْلِنَا وَقَوْمُهُمَا لَنَا

عٰبِدُوْنَ ۝ ج

ترجمہ: (المؤمنون 47) -

سو ان لوگوں نے کہا کیا ہم اپنے جیسے دو

آدمیوں پر ایمان لائیں اور حال یہ ہے کہ ان

کی قوم ہمارے زیر حکم ہے،

(بنی اسرائیل نے فرعون کو سجدے وغیرہ

عبادات نہیں کئے تھے۔ یہاں عبادت سے مراد

مراد طاعت مطلقہ ہے۔ فرعون کا قانون ان پر

لاگو تھا)

---

4)

وَتِلۡكَ نِعۡمَةٌ تَمُنُّهَا عَلَيَّ اَنۡ عَبَّدتَّ بَنِيۡۤ

اِسۡرَآءِيۡلَ ۝ ؕ

ترجمہ: (الشعراء (22 -

اور وہ جو تو مجھ پر اپنا احسان جتلا رہا

ہے سو اس کی وجہ یہ ہے کہ تو نے بنی

اسرائیل کو غلام بنا رکھا تھا،

وَقَوۡمُهُمَا لَنَا عٰبِدُوۡنَ‌ۚ اور اَنۡ عَبَّدتَّ بَنِيۡۤ اِسۡرَآءِيۡلَ

سے کیا مراد ہے۔

بنی اسرائیل کا فرعون کی عبادت سے مراد کیا

ہے ذیل میں ہے۔

وَنَادٰى فِرْعَوْنُ فِیْ قَوْمِهٖ قَالَ یٰقَوْمِ اَلَیْسَ لِیْ مُلْكُ

مِصْرَ وَهٰذِهِ الْاَنْهٰرُ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِیْۚ اَفَلَا

تُبْصِرُوْنَ ۝

ترجمہ: (الزخرف 51) -

اور فرعون نے اپنی قوم میں منا دی کرادی،

اس نے کہا کہ اے میری قوم کیا میرے

لیے مصر کا ملک نہیں ہے ؟ اور یہ نہریں

جاری ہیں میرے نیچے (یعنی اقتصادیات میرے

کنٹرول میں ہے)، کیا تم نہیں دیکھتے ؟

اَمۡ اَنَا خَیۡرٌ مِّنۡ هٰذَا الَّذِیۡ هُوَ مَهِیۡنٌ ۙ وَّلَا

یَكَادُ یُبِیۡنُ ۞ ُ

ترجمہ: (الزخرف 52) -

بلکہ میں اس شخص سے بہتر ہوں جو ذلت

والا ہے، اور وہ واضح طور پر بات بھی نہیں

کرسکتا،

فَاسۡتَخَفَّ قَوۡمَهٗ فَاَطَاعُوۡهُ ؕ اِنَّهُمۡ كَانُوۡا قَوۡمًا فٰسِقِیۡنَ

۞ (طاعت مطلقہ)

ترجمہ: (الزخرف 54) -

سو اس نے اپنی قوم کو مغلوب کرلیا سو

انہوں نے اس کی اطاعت کی، بلاشبہ وہ لوگ

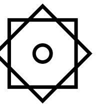
فاسقین تھے،

(موسیٰ پر بھیجا گیا قانون ترک کیا اور

فرعون کا قانون قبول کیا یہ غلامی اور عبادت

کہلایا گیا)

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰى بِاٰيٰتِنَا وَسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ ۙ



اِلٰى فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ئِهٖ فَاتَّبَعُوْٓا اَمْرَ فِرْعَوْنَ ۚ

ترجمہ: (ھود) 97 - 96 -

اور بلاشبہ ہم نے موسیٰ کو اپنی آیات اور

روشن دلیل کے ساتھ بھیجا

فرعون اور اس کے سرداروں کی طرف سو ان

لوگوں نے فرعون کی بات کا اتباع کیا

(موسیٰ پر بھیجا گیا قانون ترک کرکے فرعون

کا قانون قبول کیا۔ وَقَوۡمُهُمَا لَنَا عٰبِدُوۡنَ‌ۚ اور

اَنۡ عَبَّدْتَّ بَنِىۡۤ اِسۡرَآءِيۡلَ سے مراد یہ ہے)

) 5

وَاِنۡ اَطَعۡتُمُوۡهُمۡ اِنَّكُمۡ لَمُشۡرِكُوۡنَ ۝ (طاعت

مطلقہ)

ترجمہ: (الانعام (121 -

اور اگر تم نے ان کا کہا مانا تو بیشک

تم مشرک ہوجاؤ گے۔

(6

وَتِلْكَ عَادٌ جَحَدُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ وَعَصَوْا رُسُلَهٗ

وَاتَّبَعُوْٓا اَمْرَ كُلِّ جَبَّارٍ عَنِيْدٍ۝

ترجمہ: (ھود 59) -

اور یہ تھے قوم عاد کے لوگ جنھوں نے اپنے

رب کی آیات کا انکار کیا اور اس کے رسول

کی نافرمانی کی اور ہر سرکش ضدی کی بات

کا اتباع (طاعت مطلقہ) کیا۔

---

7)

وَمِنَ النَّاسِ مَنۡ يَّتَّخِذُ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ اَنۡدَادًا

يُّحِبُّوۡنَهُمۡ كَحُبِّ اللّٰهِ ؕ

ترجمہ: (البقرہ 165) -

اور بعض لوگ ایسے ہیں جنہوں نے خدا تعالیٰ

کے علاوہ اس کے شریک تجویز کر کھے ہیں

وہ ان سے ایسی محبت کرتے ہیں جیسی اللہ

تعالیٰ سے محبت ہونی واجب ہے

اگلے آیت میں كَحُبِّ اللّٰهِ کی تعبیر طاعت

مطلقہ سے کی گئی ہے ۔

اِذۡ تَبَرَّاَ الَّذِيۡنَ اتُّبِعُوۡا مِنَ الَّذِيۡنَ اتَّبَعُوۡا

ترجمہ(166) :

جب کہ بیزار ہوجائیں گے وہ لوگ جن کی

پیروی کی گئی ان لوگوں سے جنھوں نے

پیروی کی تھی۔

خلاصہ:

عبادت کی دوسری قسم کی تعریف طاعت

مطلقہ ہے۔

اِنِ الۡحُكۡمُ اِلَّا لِلّٰهِ (توحید فی الحاکمیت)

ترجمہ: (یوسف 40) -

حکم بس اللہ ہی کا ہے۔

مذکورہ بالا دونوں اقسام میں غور و فکر کرکے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ اللّٰہ کے فیصلے کے سامنے ہم سب انتہائی درجے کے عاجز اور بے بس ہیں ۔ (لغوی معنی – مفردات القرآن)

یہاں تک کہ عبادت بھی اللہ کے حکم کے

مطابق کریں گے کیونکہ یہی طاعت مطلقہ

یعنی عبادت کی دوسری قسم ہے۔خود سے ایجاد

کردہ عبادت کے طریقے اللہ کو منظور نہیں ہے

۔

غلامی صرف اللہ کی اور غلامی بھی اللہ کے

حکم کے مطابق نہ کہ اپنی خواہش کے

مطابق ۔

—

دونوں قسم کا خلاصہ:

عبادت = محبت یعنی طاعتِ مطلقہ اور بغیر ظاہری سبب کے عقلی اختیاری امید اور خوف رکھنا ۔

واللہ تعالیٰ اعلم

اسلامی عقیدہ میں 'عطائی الوہیت' کی مغالطہ

پچھلی پوسٹ (عبادت) میں، میں نے عبادت و الوہیت کی علت میں آیات پیش کیں، جن میں اللہ تعالیٰ نے الوہیت اور عبادت کے اثبات کے لیے دو بنیادی دلائل دیے:

1▪

الاسباب تصرف، بغیر ظاہری اسباب کے قدرت رکھنا

2▪

علم غیب، بغیر ظاہری اسباب کے جاننا

یعنی جو ہستی بغیر ظاہری اسباب کے علم رکھتی ہے اور قدرت رکھتی ہے، وہی معبود کہلانے کی مستحق ہے۔

عبادت کی تعریف:

عبادت = محبت یعنی طاعتِ مطلقہ اور بغیر ظاہری سبب کے عقلی اختیاری امید اور خوف رکھنا۔

اب اس تصور میں "ذاتی" اور "عطائی" کی تقسیم غیر مناسب ہے، کیونکہ کسی مخلوق کو "ذاتی اِلٰہَ" کہنا بھی شرک ہے اور "عطائی اِلٰہَ" کہنا بھی شرک ہے۔

عطائی الوہیت کا مغالطہ

حضرت شاہ ولی اللّٰہ رحمہ اللّٰہ نے حجۃ اللّٰہ البالغہ (کتاب التوحید، ج ، ص) میں مشرکین کے اس نظریے کو واضح کیا:

ترجمہ :

"مشرکین نے بڑے امور کی تدبیر میں ،

مسلمانوں کی موافقت کی ، اور ان امور میں

جن کا اٹل ویقیناً فیصلہ ہو چکا کسی اور

کے لئے اس میں کوئی اختیار نہیں چھوڑا گیا،

اور تمام امور میں ان کی موافقت نہیں کی۔

ان کا مذہب یہ ہے کہ ان سے پہلے نیک

لوگوں نے اللہ تعالی کی عبادت کی اور اس کا

قرب حاصل کیا، جس پر اللہ تعالی نے ان

کو الوہیت عطا کی ، پس وہ اللہ تعالی کے

تمام مخلوق میں عبادت کے مستحق ٹھہرے،

جیسا کہ شہنشاہ کا غلام اس کی خدمت بڑی

خوبی کے ساتھ کرتا ہے، تو بادشاہ اس کو

شاہی خلعت عطا کرتا ہے اور اس کو اپنی

سلطنت میں سے کسی علاقے کا انتظام سپرد

کر دیتا ہے ، پس وہ اس ملک کے لوگوں

سے سمع واطاعت کا مستحق ٹھہرتا ہے"۔

موجودہ دور میں عطائی تصرف اور علم غیب

کا دعویٰ[1]

آج کے قبر پرست اور بعض خود کو اہل

سنت کہنے والے لوگ یہی دلیل دیتے ہیں کہ:

"ہم انبیاء اور اولیاء کو ذاتی طور پر قادر

نہیں مانتے، بلکہ عطائی تصرف اور عطائی

علم غیب مانتے ہیں، مگر انہیں معبود نہیں

مانتے".

جبکہ حقیقت یہ ہے کہ اللّٰہ تعالیٰ نے الوہیت

کے اثبات کے لیے یہی دو علتیں بیان کی

ہیں:

بغیر ظاہری سبب کے علم رکھنے والا

بغیر ظاہری سبب کے قدرت رکھنے والا

پس، جو بھی مخلوق میں یہ صفات تسلیم کرے گا، وہ الوہیت کا اقرار کرے گا، چاہے وہ اسے کوئی بھی نام دے۔

)ذاتی نہ سہی عطائی الوہیت تو ہے(

مثال:

یہ ایسے ہی ہے جیسے کوئی شخص چوری

کرے، جو اسلامی شریعت میں چوری کے زمرے

میں آتا ہے، لیکن وہ خود اسے چوری کا نام

نہ دے کر کوئی اور نام دے دے۔ اس سے

حقیقت نہیں بدلتی۔

خلاصہ:

کسی مخلوق کو "ذاتی اِلٰہَ" ماننا بھی شرک ہے،

اور "عطائی اِلٰہَ" ماننا بھی شرک ہے۔

نوٹ: واضح رہے کہ "بغیر ظاہری سبب" سے

مراد ایسا سبب ہے جس پر کوئی معتبر اور

معقول دلیل موجود نہ ہو——نہ دلیلِ ہدیٰ

(قرآن و حدیث) اور نہ دلیلِ بدیہی (عقلِ

سلیم یا مشاہداتی دلیل)۔ اگر ان دونوں ذرائع

سے کسی سبب کے متعلق تصرف یا علم پر

کوئی دلیل نہ ہو، اور پھر بھی اسے مان کر

مدد طلب کی جائے، تو یہ حقیقت میں

الوہیت تسلیم کرنے کے مترادف ہوگا، کیونکہ

اس میں مافوق الاسباب کا گمان ہوتا ہے۔ اسی

بنیاد پر سورۃ المؤمنون، آیت نمبر 117 میں
ایسے عقیدے پر کفر کا فتویٰ دیا گیا ہے،
کیونکہ اس میں غیبی تسلط و تصرف اور
علمِ غیب تسلیم کر کے مدد طلب کی جاتی
ہے، جو کہ الوہیت کے لئے علت ہیں۔

یہ بھی واضح رہے کہ دلیل کی ضرورت تب
پیش آتی ہے جب کسی سے مدد طلب کی
جائے، کیونکہ بلا دلیل مدد طلب کرنا مافوق
الاسباب کے گمان کا سبب بنتا ہے۔ اگرچہ

دنیا میں بہت سی مخلوقات ایسی ہیں جن

کے تصرف اور علم کے ذرائع ہمارے لیے

نامعلوم ہیں، لیکن اصل مسئلہ یہ ہے کہ

بغیر دلیل کے ان سے مدد طلب نہیں کی جا

سکتی۔ مزید تفصیل کے لیے اس موضوع پر

لکھا گیا مضمون (دلیل) ملاحظہ کریں۔

واللہ تعالیٰ اعلم

دلیل

اللہ تعالیٰ نے دلیل کی اہمیت پر بہت زور دیا ہے۔

نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

"مَنْ كَذَبَ عَلَيَّ مُتَعَمِّدًا فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ"۔

ترجمہ: "جس نے جان بوجھ کر مجھ پر جھوٹ باندھا، وہ اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنا لے"۔

حوالہ:

صحیح بخاری: حدیث نمبر 109، 1291،

110

صحیح مسلم: حدیث نمبر 3

شرعی دلیل کی تین اقسام پر میں پہلے ہی پوسٹ کر چکا ہوں:

1۔

عقلی دلیل

■2

دلیلِ ہدیٰ یعنی وحی یعنی قرآن و حدیث

■3

دلیلِ بدیہی/روشن دلیل جیسے دو جمع دو

چار، تجربات اور مشاہدات پر مبنی دلیل

■■■

دلیل کا استعمال

عقلی دلیل کے ذریعے اللہ تعالیٰ (خالق) کے

وجود اور قرآن و حدیث کی حقانیت کو

پہچانا جاتا ہے۔ اس کے بعد نامعلوم امور کے

لیے دلیلِ ہدیٰ اور دلیلِ بدیہی کا استعمال کیا

جاتا ہے۔ اللہ کے احکامات اور فیصلوں کو

معلوم کرنے کے لیے دلیلِ ہدیٰ اور دلیلِ

بدیہی کا سہارا لیا جاتا ہے، اور دلیلِ ہدیٰ،

دلیلِ بدیہی پر غالب ہے۔

مثال کے طور پر، پانی کے ذریعے اللہ پیاس
بجھاتا ہے، یہ دلیلِ بدیہی سے ثابت ہے، اس
لیے پیاس بجھانے کے لیے اللہ کی براہ راست
مدد پانی کے ذریعے طلب کی جا سکتی ہے۔
اسی طرح سورج کی تپش سے کپڑوں کا سوکھنا
اور انٹرنیٹ کے ذریعے بات چیت کرنا دلیلِ
بدیہی کی مثالیں ہیں۔

البتہ، اگر کوئی کہے کہ بارش ستاروں کی
گردش کے سبب ہوتی ہے، تو یہ دلیلِ بدیہی

نہیں ہے اور دلیلِ ہدیٰ میں اس کی ممانعت
کی گئی ہے۔ لہٰذا، یہ عقیدہ رکھنا درست
نہیں کہ بارش ستاروں کی گردش سے ہوتی ہے۔

دعاؤں کی قبولیت بدیہی دلیل کا معیار نہیں

دعاؤں کا قبول یا مسترد ہونا اس بات کا
معیار نہیں بن سکتا کہ ان کی بنیاد پر
نامعلوم امور کو معلوم کیا جائے یا کسی

عقیدے کو حق ثابت کیا جائے۔ مثال کے

طور پر بعض لوگ کسی واقعے کو دلیل بنا

لیتے ہیں کہ "شیخ فلاں کی برکت سے میری

مشکل حل ہوگئی"، اور اس سے شیخ کی

کرامت یا فوقیت ثابت کرنے کی کوشش کرتے

ہیں۔ لیکن اگر یہی طرزِ استدلال اختیار کیا

جائے تو ہندوؤں یا دیگر مذاہب کے پیروکاروں

کی دعاؤں کے پورا ہونے کو بھی ان کے

معبودوں کی حقانیت کی دلیل ماننا پڑے گا۔

حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ دعاؤں کا قبول ہونا

اللہ تعالیٰ کی مشیت، آزمائش اور کائناتی

تدابیر کے تحت ہوتا ہے، نہ کہ کسی غیر

کے استقلال یا الوہیت کی وجہ سے۔

اصل میں، جو لوگ قبروں میں مدفون ہیں،

وہ ہمارے پکارنے سے غافل ہیں، جیسا کہ

سورۂ احقاف، آیت 5 میں بیان کیا گیا ہے۔

مزید یہ کہ اگر کسی کا دعویٰ ہو کہ قبر

والے ہماری پکار سے باخبر ہیں اور مدد کرتے

ہیں، تو اس کے لیے یہ دلیل بھی پیش کرنا

ہوگی کہ وہ ایسا کون سے وسیلے اور اسباب
کے ذریعے کرتے ہیں، کیونکہ بغیر کسی سبب
کے سننا اور مدد کرنا صرف اللہ کی خاصیت
ہے۔

مخلوق کی صفات محدود اور ماتحت الاسباب
ہیں، اس لیے جب مخلوق سے مجازی مدد
طلب کی جائے تو دلیل کی ضرورت پڑتی ہے۔
مثلاً چونکہ مخلوق کا علم اور قدرت محدود
ہیں، اس لیے پہلے یہ جاننا ضروری ہے کہ

جسے پکارا جا رہا ہے، وہ معاملہ اس کے علم

اور قدرت کے دائرے میں آتا بھی ہے یا

نہیں۔

دلیلِ ہدیٰ کی برتری

دلیلِ ہدیٰ، دلیلِ بدیہی پر غالب ہے۔ جب

قرآن و حدیث میں کسی چیز کی ممانعت

موجود ہو، تو اگرچہ دلیلِ بدیہی سے وہ چیز

ثابت بھی ہو جائے، پھر بھی وہ جائز نہیں۔

مثال کے طور پر، چوری، شراب اور جادو میں

کچھ اثرات موجود ہیں، جو دلیلِ بدیہی سے

معلوم ہوتے ہیں، لیکن پھر بھی یہ چیزیں

حرام ہیں کیونکہ دلیلِ ہدیٰ میں ان کی

ممانعت کی گئی ہے۔

دلیلِ بدیہی کو معلوم کرنے کے لیے تجربات

کیے جا سکتے ہیں، لیکن یہ دیکھنا ضروری ہے

کہ دلیلِ ہدیٰ میں اس کی ممانعت تو نہیں

کی گئی۔

کسی مخلوق سے مجازی مدد طلب کرنے کے

لیے اس کے ظاہری سبب کو دیکھا جاتا ہے،

نہ کہ یہ حقیقت کہ اللہ اس سے کچھ بھی

کروا سکتا ہے۔

اگر کسی کے جاننے یا مدد کرنے پر ظاہری

سبب کی دلیل، یعنی دلیلِ ہدیٰ (قرآن و

حدیث) یا دلیلِ بدیہی (واضح عقلی یا تجرباتی

دلیل) موجود نہ ہو، اور پھر بھی مدد طلب کی جائے، تو اس میں مافوق الاسباب کا گمان ہوتا ہے۔ جبکہ الوہیت کے لیے "مافوق الاسباب علمِ غیب" اور "مافوق الاسباب تصرف" کو علت قرار دیا گیا ہے۔

البتہ، جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا، دلیلِ بدیہی معلوم کرنے کے لیے تجربات کیے جا سکتے ہیں، لیکن یہ دیکھنا ضروری ہے کہ دلیلِ ہدیٰ میں اس کی ممانعت تو نہیں۔

مثلاً، سورۃ الأحقاف آیت 5 کے مطابق قبر میں رہنے والے قیامت تک ہماری پکار سے غافل ہیں، لہٰذا اس پر تجربے کی ضرورت نہیں کہ وہ ہم سے باخبر ہوتے ہیں یا نہیں، کیونکہ دلیلِ ہدیٰ، دلیلِ بدیہی پر غالب ہے۔

معجزہ معیار نہیں

معجزہ کسی چیز کے حلال یا حرام ہونے کا

معیار نہیں بن سکتا۔

کسی مخلوق سے مجازی مدد طلب کرنے میں

اس کی عادی صلاحیت کو مدنظر رکھا جاتا

ہے، نہ کہ یہ حقیقت کہ وہ اللہ کی قدرت

سے کچھ بھی کر سکتی ہے۔

مثال کے طور پر، شریعت نے دھاگہ پہننا

ممنوع قرار دیا ہے، جبکہ مرہم کی پٹی لگانا

جائز ہے۔ اگرچہ اللہ تعالیٰ دھاگہ پہننے سے بھی

شفا دے سکتا ہے، لیکن اس کے باوجود یہ

ممنوع ہے کیونکہ کسی چیز کا حلال یا حرام ہونا معجزے کے امکان پر منحصر نہیں ہوتا۔

تاہم اسمائے حسنیٰ اور نیک اعمال کو وسیلہ بنا کر اللہ سے براہِ راست، اس کی شان کے مطابق دعا کرے۔ کیونکہ اللہ کی رضامندی سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں، اس لیے اسی کی رضامندی طلب کرے۔

معجزے کے لیے ہر موقع پر دلیل پیش کرنا ضروری ہوتا ہے۔

مثلاً، آگ کی ٹھنڈک کے ایک واقعے پر دلیل

پیش کرنا دیگر مواقع کے لیے کافی نہیں،

کیونکہ آگ عادۃً گرم ہوتی ہے۔ لہٰذا، آگ کی

ٹھنڈک کے ہر نئے واقعے کے لیے یا تو دلیلِ

ھدیٰ (شرعی دلیل) یا دلیلِ بدیہی (واضح اور

مشاہداتی دلیل) کی ضرورت ہوگی۔ حضرت

ابراہیم علیہ السلام کا آگ میں محفوظ رہنا

ایک معجزہ تھا، مگر یہ دلیل نہیں بن سکتا

کہ ہر موقع پر آگ کسی کو نقصان نہیں

پہنچائے گی کیونکہ آگ عادۃً گرم ہوتی ہے۔

اس لئے دیگر مواقع کے لئے بھی الگ دلیل کی

ضرورت ہے ۔

اسی طرح نبی کریم ﷺ کا کسی ایک بات

سے معجزاتی طور پر باخبر ہونا، دیگر باتوں

سے باخبر ہونے کی دلیل نہیں بن سکتا۔

واضح رہے کہ دلیلِ بدیہی وہ مشاہداتی دلیل

ہوتی ہے جس میں شک کی گنجائش نہیں،

جیسے پانی کا پیاس بجھانا یا سورج کی تپش

سے کپڑوں کا سوکھنا۔ تاہم، انبیاء کرام کے

معجزات ہمارے لیے دلیلِ بدیہی سے ثابت

نہیں بلکہ صرف دلیلِ ہدیٰ سے ثابت ہیں،

اور دلیلِ ہدیٰ ہی کافی ہے۔ پیغمبروں کے

زمانے میں ان کے معجزات کو دیکھنے والوں

کے لیے ایک طرف دلیلِ ہدیٰ تھی اور دوسری

طرف دلیلِ بدیہی، لیکن یہ دلیلِ بدیہی صرف

اس وقت تھی جب معجزہ مشاہدہ کیا گیا۔

مثلاً، معراج کا واقعہ کسی نے دیکھا نہیں،

بلکہ نبی کریم ﷺ نے اس کی خبر دی،

جو دلیلِ ہدیٰ ہے۔ اس لیے نبی ﷺ کے

صحابہ کے پاس معراج پر دلیلِ ہدیٰ تھی،
مگر دلیلِ بدیہی نہیں، جبکہ خود نبی ﷺ
کے پاس دونوں تھیں۔

لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ نبی ﷺ
اس کے بعد بھی کئی مرتبہ معراج کا سفر
کر چکے ہیں یا اب بھی کر رہے ہیں۔ اگر
کوئی یہ دعویٰ کرے کہ نبی ﷺ اب بھی
معراج پر جاتے ہیں تو اس کے لیے الگ
دلیل پیش کرنا ضروری ہوگا، کیونکہ معراج

کے واقعے کی دلیل دیگر سفر کے لیے معتبر نہیں ہو سکتی۔

علم کی تخصیص کے لیے دلیل ضروری ہے

اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کو بہت علم دیا ہے، لیکن ہر علم کی تخصیص کے لیے دلیل کی ضرورت ہے۔ مثال کے طور پر، اگر یہ کہا جائے کہ نبی کریم ﷺ کو الیکٹران

اور پروٹان کے متعلق علم تھا، تو اس کے لیے دلیل ہونی چاہیے۔

جب بات اللہ کی ہو تو کوئی دلیل درکار نہیں، کیونکہ اس کا علم کامل اور مکمل ہے۔

اب فرض کریں کہ تمام انگریزی حروفِ تہجی کے کھلونے ایک جیب میں چھپے ہوئے ہیں۔

اگر کوئی کہے، "اس میں 'A' ہے،" تو اس پر کوئی دلیل درکار نہیں۔

لیکن جب مخلوق کی بات ہو تو دلیل ضروری ہوتی ہے، کیونکہ مخلوق کا علم محدود ہے۔

اب، اگر جیب میں صرف تین حروف ہوں اور کوئی دعویٰ کرے، "اس میں 'A' ہے،" تو اسے دلیل فراہم کرنی ہوگی۔

مزید برآں 'A' ، کی موجودگی ثابت کرنے کے بعد، اگر کوئی یہ دعویٰ کرے کہ "اس میں 'B' بھی ہے،" تو اس کے لیے الگ دلیل درکار ہوگی، کیونکہ 'A' پر دی گئی دلیل 'B' کے لیے کافی نہیں ہوگی۔

معلومات کی دو قسمیں ہوتی ہیں:

1. جن کے بنیادی اصول معلوم ہوں، جیسے جمع، تفریق، ضرب وغیرہ، تو مزید مسائل حل کیے جا سکتے ہیں۔

2. جن کے بنیادی اصول معلوم نہ ہوں، تو کسی ایک معاملے کا معلوم ہونا دوسرے معاملے کا علم ہونے کی دلیل نہیں بن سکتا۔ مثال کے طور پر، اگر 5×6 کا نتیجہ معلوم ہے، تو اس سے 8×7 کا نتیجہ خودبخود معلوم نہیں ہوگا، بلکہ اس کے لیے الگ دلیل درکار ہوگی۔

■■■

معجزات کی تخصیص کے لیے دلیل درکار ہے

حضرت سلیمان علیہ السلام کے لیے ہوا کو

تابع کیا گیا تھا، اور ان کے پاس دلیلِ ہدیٰ

بھی تھی اور دلیلِ بدیہی بھی۔ اگرچہ دلیلِ

ہدیٰ کافی تھی، مگر اس زمانے کے لوگوں کے

پاس بھی یہ دلیل مسلسل موجود تھی کہ

حضرت سلیمان علیہ السلام کے لیے ہوا تابع

کی گئی ہے، کیونکہ وہ خود اپنی آنکھوں سے

اس معجزے کا مشاہدہ کرتے تھے اور اس کا

تسلسل بھی دیکھتے تھے۔ اس لیے وہ حضرت

سلیمان علیہ السلام سے کہہ سکتے تھے کہ

ہمیں اپنے تخت پر سفر کروائیں، کیونکہ ہر

بار ان کے لیے اس معجزے پر دلیل موجود

تھی، بشرطیکہ دلیلِ ہدیٰ میں مدد طلب کرنے

سے منع نہ کیا گیا ہو۔ لیکن آج، نہ

ہمارے پاس اس معجزے کا کوئی تسلسل

ثابت ہے اور نہ ہی اس پر دلیلِ ہدیٰ (قرآن

و حدیث) یا دلیلِ بدیہی ہے، اس لیے اب

حضرت سلیمان علیہ السلام سے اس معاملے میں

مجازی مدد طلب کرنا جائز نہیں۔ یہی معاملہ

حضرت داؤد علیہ السلام کے لوہے کو نرم کرنے

کے معجزے کا ہے، جو ان کے دور میں دلیلِ

ہدیٰ اور دلیلِ بدیہی دونوں سے ثابت تھا،

مگر آج ہمارے پاس اس کی کوئی دلیل

نہیں۔

معجزات اور کرامات پر اجمالی ایمان رکھنا

ضروری ہے، لیکن ہر معجزے کی تخصیص کے

لیے دلیل درکار ہے۔

مدد طلب کرنا

زندہ انسان کی ظاہری چال ایک نمایاں سبب
ہے، جس کی بنیاد پر کسی دوسرے زندہ
انسان سے مجازی پناہ طلب کی جا سکتی ہے۔
جبکہ شیطان اور اس کی چالیں پوشیدہ اور
غیبی امور میں سے ہیں، اسی لیے شیطان سے
پناہ براہِ راست اللہ سے طلب کی جاتی ہے۔

واضح رہے کہ "بغیر ظاہری سبب" سے مراد

ایسا سبب ہے جس پر کوئی معتبر اور معقول

دلیل موجود نہ ہو—نہ دلیلِ ہدیٰ (قرآن و

حدیث) اور نہ دلیلِ بدیہی (عقلِ سلیم یا

مشاہداتی دلیل)۔ اگر ان دونوں ذرائع سے کسی

سبب کے متعلق تصرف یا علم پر کوئی دلیل

نہ ہو، اور پھر بھی اسے مان کر مدد طلب

کی جائے، تو یہ حقیقت میں الوہیت تسلیم

کرنے کے مترادف ہوگا، کیونکہ اس میں مافوق

الاسباب کا گمان ہوتا ہے۔ اسی بنیاد پر سورۃ

المؤمنون، آیت نمبر 117 میں ایسے عقیدے پر

کفر کا فتویٰ دیا گیا ہے، کیونکہ اس میں

غیبی تسلط و تصرف اور علمِ غیب تسلیم کر

کے مدد طلب کی جاتی ہے، جو کہ الوہیت کے

لئے علت ہیں۔

یہ بھی واضح رہے کہ دلیل کی ضرورت تب

پیش آتی ہے جب کسی سے مدد طلب کی

جائے، کیونکہ بلا دلیل مدد طلب کرنا مافوق

الاسباب کے گمان کا سبب بنتا ہے۔ اگرچہ

دنیا میں بہت سی مخلوقات ایسی ہیں جن

کے تصرف اور علم کے ذرائع ہمارے لیے

نامعلوم ہیں، لیکن اصل مسئلہ یہ ہے کہ

بغیر دلیل کے ان سے مدد طلب نہیں کی جا

سکتی۔

بدیہی دلیل میں یا تو سبب کا براہ راست

مشاہدہ کیا جاتا ہے، یا مسبب سے واضح ہوتا

ہے کہ کسی نہ کسی سبب کا استعمال کیا

گیا ہے۔

صحیح مسلم 4653/1795 میں ہے

جبرائیل علیہ السلام نے فرمایا:

اللہ تعالیٰ نے پہاڑوں کا فرشتہ آپ کی طرف

بھیجا ہے تاکہ آپ ان کفار کے متعلق اس

کو جو چاہیں حکم دیں ۔" (دلیل ھدیٰ)

آپ ﷺ نے فرمایا :" پھر مجھے پہاڑوں

کے فرشتے نے آواز دی اور سلام کیا ، پھر

کہا : اے محمد ! اللہ تعالیٰ نے آپ کی

قوم کی طرف سے آپ کو دیا گیا جواب سن

لیا ، میں پہاڑوں کا فرشتہ ہوں اور مجھے

آپ کے رب نے آپ کے پاس بھیجا ہے کہ

آپ مجھے جو چاہیں حکم دیں ، اگر آپ

چاہیں تو میں ان دونوں سنگلاخ پہاڑوں کو (

اٹھا کر) ان کے اوپر رکھ دوں ۔" (دلیل

بدیہی)

یہاں پر نبی کریم ﷺ کے پاس دلیل ھدیٰ

بھی تھا اور دلیل بدیہی بھی، دلیل ھدیٰ

کافی تھا ، اس لئے نبی کریم ﷺ پہاڑوں

کے فرشتے سے مجازی مدد طلب کر سکتے تھے

۔

)ہمارے پاس اس کے متعلق دلیل ھدیٰ اور

دلیل بدیہی نہیں ہے تو مجازی مدد بھی

فرشتہ سے طلب نہیں کر سکتے ۔ اگر ہو

تب طلب کرے لیکن معجزہ سے استدلال نہ

کرے۔ واللہ تعالیٰ اعلم)

دلیل ، دعویٰ کے بالکل مطابق ہو

اگر کسی چیز کے نفس ثبوت کا دعوی ہو تو

اس کے مطابق دلیل کافی ہے اور اگر ساتھ

کسی خاص ہیئت و شکل یا مقدار و کیفیت

وغیرہ کا بھی دعوی ہو تو دلیل کا بھی ان

باتوں پر مشتمل ہونا ضروری ہے ، اگر زید

کے متعلق دعویٰ کیا جائے کہ " وہ آیا ہے

" تو صرف آنے پر کوئی دلیل پیش کر نا

کافی ہے، لیکن اگر دعویٰ یہ ہو کہ " وہ

صبح کے وقت آیا تھا " یا " وہ پیادہ پا

آیا تھا " تو صرف یہ کہنا کسی طرح کافی

نہیں ہے کہ میں نے یا فلاں شخص نے اس

کو آتے دیکھا ہے بلکہ ساتھ یہ بھی ثابت کر

ناضروری ہے کہ وہ صبح کے وقت / پیادہ پا

آیا تھا ، ورنہ پورا دعوی ثابت نہ ہو گا

اور دعویٰ کا یہ حصہ بلا دلیل سمجھا جائے

گا۔

یوں ہی اگر دعوی یہ ہو کہ جمعرات یا

جمعہ کے دن صدقہ کرنا افضل ہے تو سند

میں ان روایات کو پیش کر دینا بالکل کافی

نہیں ہے جن میں مطلق صدقہ کے فضائل

وارد ہوئے ہیں بلکہ خاص اس وقت کے

متعلق دلائل دینا ضروری ہے جس کا دعویٰ

کیا جا رہا ہے ، ورنہ تو دعوی بے دلیل

شمار ہوگا۔

■■■

اجتہاد اور بدعت

]اگر کسی عالم کے پاس دلیل ہو، لیکن
کسی دوسرے کو اس کا علم نہ ہو، اور وہ
اپنی قیاس آرائی پر اجتہاد کرکے عمل کرے،
تو یہ بدعت کے زمرے میں آ سکتا ہے،
چاہے وہ حق تک پہنچ بھی جائے کیونکہ وہ
اپنی خواہش کی پیروی میں لگا ہوا ہے نہ اس

کے ذہن میں اس مسئلہ کے متعلق قرآن کی

آیت موجود ہے نہ حدیث اور نہ صحابہ کرام

کے اقوال ۔ واللہ تعالیٰ اعلم

إِن يَتَّبِعُونَ إِلَّا الظَّنَّ وَإِنْ هُمْ إِلَّا يَخْرُصُونَ

ترجمہ: "یہ لوگ صرف گمان کی پیروی کرتے

ہیں اور محض اٹکل دوڑاتے ہیں"۔

)سورة الأنعام(116 :

قرآن و حدیث کا مفہوم وہی معتبر ہے جو

صحابہ کرام کی تعلیمات کے مطابق ہو، جیسا

کہ قرآن میں ہے: آمِنُوا كَمَا آمَنَ النَّاسُ

(البقرۃ: 13)۔ ایمان درحقیقت قرآن و حدیث کے علم پر مبنی ہے، اور جس مفہوم پر صحابہ کرام متفق ہوں (یعنی اجماع)، وہی درست اور معتبر ہوگا]۔

خلاصہ

1. دلیلِ ہدیٰ یا دلیلِ بدیہی کا ہونا ضروری ہے۔

دلیل ھدیٰ غالب ہے دلیل بدیہی پر۔

▪2 معجزہ کسی چیز کے حلال یا حرام ہونے کا معیار نہیں۔

▪3 ہر معجزے کے لیے دلیل ضروری ہے، اور ایک معجزہ دوسرے معجزے کی دلیل نہیں بن سکتا۔

واللہ تعالیٰ اعلم

دلیل کی اہمیت

اِنِ الۡحُکۡمُ اِلَّا لِلّٰہِ ؕ

ترجمہ: حکم بس اللہ ہی کا ہے ۔

یوسف 40 :

حاکمیت کا مطلب کیا ہے اس پر میں مضمون بنا چکا ہوں ۔

توحید فی الحاکمیت کا فائدہ اور مطالبہ دلیل کی اہمیت ہے۔

مشرکین اللّٰہ کی عبادت کرتے ہیں لیکن اللہ کی طرف سے عبادت پر کوئی دلیل و سند کا اقرار نہیں کرتے۔

قرآن میں ارشاد ہے:

"اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اس (چیز) کی پیروی کرو جو اللہ نے نازل کی ہے، تو وہ کہتے ہیں: بلکہ ہم تو اسی کی پیروی کریں گے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے۔ کیا (یہ پیروی کریں گے) اگرچہ ان

کے باپ دادا نہ کچھ سمجھتے ہوں اور نہ ہی

ہدایت یافتہ ہوں"؟

البقرہ 170 -

جبکہ یہود و نصاری کتاب (شرعی دلیل) مانتے

تو ہے لیکن شرعی دلیل کو ہلکا سمجھتے ہیں

تحقیق نہیں کرتے اور نا قابل عمل اور

منسوخ دلیل کی پیروی کرتے ہیں ۔

منکرین حدیث تحقیق میں حد سے تجاوز

کرتے ہیں ۔

وَاِذۡ قُلۡتُمۡ يٰمُوۡسٰى لَنۡ نُّؤۡمِنَ لَكَ حَتّٰى نَرَى اللّٰهَ جَهۡرَةً فَاَخَذَتۡكُمُ الصّٰعِقَةُ وَاَنۡتُمۡ تَنۡظُرُوۡنَ۝ ۝

ترجمہ:

اور جب تم نے (موسی سے) کہا کہ موسیٰ جب تک ہم خدا کو سامنے نہ دیکھ لیں گے تم پر ایمان نہیں لائیں گے تو تم کو بجلی نے آگھیرا اور تم دیکھ رہے تھے۔

البقرہ 55 -

ہر بدعت فی الدین گمراہی ہے۔ البتہ ہر

بدعت غیر دین گمراہی نہیں ہے ۔

نبی کریم ﷺ نے واضح طور پر فرمایا ہے

کہ:

"وَإِيَّاكُمْ وَمُحْدَثَاتِ الْأُمُورِ فَإِنَّ كُلَّ مُحْدَثَةٍ

بِدْعَةٌ وَكُلَّ بِدْعَةٍ ضَلَالَةٌ" ۔ ◌ٗ

ترجمہ: نئی نئی بدعات و اختراعات سے اپنے

آپ کو بچائے رکھنا ، بلاشبہ ہر نئی بات

بدعت ہے اور ہر بدعت گمراہی ہے ۔

حوالہ: سنن ابی داود: 4607، جامع الترمذی: 2676، سنن النسائی1579 :

نبی ﷺ نے خود فرمایا:

"کل بدعة ضلالة"

ترجمہ: ہر بدعت گمراہی ہے

حوالہ: صحیح مسلم2005 / 867 :

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

مَن أَحْدَثَ فِي أَمْرِنَا هَذَا مَا لَيْسَ مِنْهُ فَهُوَ

رَدٌّ

ترجمہ: جس نے ہمارے اس دین میں کوئی

ایسی نئی چیز داخل کی جو اس میں سے

نہیں ہے، تو وہ مردود ہے۔

حوالہ: صحیح البخاری: 2697، صحیح

مسلم4492 / 1718 :

(فِي أَمْرِنَا = فی الدین)

ایک اور روایت میں الفاظ یوں ہیں:

مَن عَمِلَ عَمَلًا لَيسَ عَلَيهِ أَمرُنا فَهُوَ رَدٌّ

ترجمہ: جس نے کوئی ایسا عمل کیا جس

پر ہمارا حکم (طریقہ) نہیں تھا، تو وہ مردود

ہے۔

حوالہ: صحیح مسلم4493 / 1718 :

یہ احادیث واضح طور پر بتاتی ہے کہ دین

میں نیا اضافہ (بدعت) گمراہی ہے، اور اس

میں "بدعت حسنہ" اور "بدعت سیئہ" کی

کوئی تقسیم موجود نہیں۔

والله تعالیٰ اعلم

محبت و نفرت کا اصل معیار – اللہ کے لئے

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

»مَنْ أَحَبَّ لِلَّهِ وَأَبْغَضَ لِلَّهِ، وَأَعْطَى لِلَّهِ وَمَنَعَ لِلَّهِ فَقَدِ اسْتَكْمَلَ الْإِيمَانَ«

رواه أبو داود (حديث: 4681)، اسناده حسن۔

ترجمہ:

"جس نے اللہ کے لئے محبت کی، اللہ کے لئے بغض رکھا، اللہ کے لئے عطا کیا اور اللہ کے لئے روک لیا، اس نے اپنا ایمان مکمل کر لیا"۔

دنیا میں پسند اور ناپسند کے بہت سے معیار رائج ہیں، جیسے رسم و رواج، نسل پرستی، لسانیت، قومیت، وطنیت اور عصبیت وغیرہ۔ لیکن اصل اور درست معیار صرف ایک ہے، اور وہ ہے اللہ۔

یعنی پسند اور ناپسند اللہ کے لئے کی جائے۔

اسی معیار پر سالم انسانیت میں وحدت قائم

ہو سکتی ہے، اگر مرکز اللہ کو بنایا جائے۔

اسی لئے جو جماعت یا گروہ اللہ کے سوا

کسی اور چیز کو مرکز بناتا ہے اور لوگوں کو

فرقہ، پارٹی یا تنظیم کی طرف بلاتا ہے تو

وہ فرقہ واریت پھیلاتا ہے۔ لیکن جو جماعت

صرف اللہ کی طرف بلاتی ہے، وہ فرقہ واریت

میں شمار نہیں ہوتی۔

قرآن میں اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ سے فرمایا:

أَتُحَاجُّونَنَا فِي اللَّهِ وَهُوَ رَبُّنَا وَرَبُّكُمْ (البقرہ : 139)

"کیا تم ہم سے اللہ کے بارے میں جھگڑتے ہو، حالانکہ وہ ہمارا رب ہے اور تمہارا بھی رب ہے"؟

میں تمہیں کونسا "محمدیت" کی طرف بلاتا ہوں؟

میں تو تمہیں اللہ کی طرف بلاتا ہوں۔ دین اسلام (قرآن و حدیث) کا مرکز اللہ ہے، اور اسی اللہ کی طرف بلانے کا پروگرام ہے۔ اسلام کوئی فرقہ یا جماعت نہیں کہ صرف اپنے کارکنان بڑھانے میں لگا رہے، بلکہ یہ وہ نظام ہے جو تمام انسانیت کو ایک اللہ کے تحت جوڑنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

واللہ تعالیٰ أعلم

—

عقیدہ و عمل کا توازن اور سیاسی ذمہ داری کا اسلامی تصور

اسلام میں انسان کی ذمہ داری دو پہلوؤں پر مشتمل ہے — عقیدہ (باطن کا ایمان) اور عمل (ظاہر کی کوشش)

عقیدے کے لحاظ سے مومن کا یقین یہ ہونا چاہیے کہ اگر ساری دنیا مل کر بھی میرے

خلاف سازش کر لے، تب بھی وہ مجھے نقصان نہیں پہنچا سکتی جب تک میرا رب میرا حامی و ناصر ہے۔

قرآن میں ارشاد ہے:

> اتَّقُوا اللهَ حَقَّ تُقَاتِهِ◌

"اللہ سے ڈرو جیسا کہ اس سے ڈرنے کا حق ہے"۔

آل عمران 102

یہ آیت ایمان کے اعلیٰ معیار کی یاد دہانی ہے — کہ بندہ دل سے مکمل طور پر اللہ پر بھروسہ کرے۔

مگر اللہ نے انسان کو فطرتاً کمزور بھی پیدا کیا ہے، اس لیے ایمان کے ساتھ ساتھ اس پر عملی استطاعت کی رعایت بھی رکھی ہے۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

> فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ

"پس اللہ سے ڈرو جتنا تم سے ہو سکے"۔

التغابن 16

یعنی عقیدۃً انسان پر توکل، صبر، اور یقین میں کمال مطلوب ہے، لیکن عملاً وہ اپنی بساط اور طاقت کے مطابق مکلف ہے۔

اسلام انسان سے زہر کھا کر تقویٰ و توکل کا مطالبہ نہیں کرتا، بلکہ اسے حکم دیتا ہے کہ وہ اسباب اختیار کرے اور نتیجہ اللہ پر چھوڑ دے۔

موسیٰ علیہ السلام کی مثال: عقیدہ کامل، عمل انسانی فطرت کے مطابق

یہی فرق اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی حضرت موسیٰ علیہ السلام کے عمل سے واضح کیا۔

جب اللہ نے انہیں عصا پھینکنے کا حکم دیا تو وہ سانپ بن گیا۔ قرآن کہتا ہے:

> فَلَمَّا رَآهَا تَهْتَزُّ كَأَنَّهَا جَانٌّ وَلَّىٰ مُدْبِرًا وَلَمْ يُعَقِّبْ ۚ يَا مُوسَىٰ لَا تَخَفْ إِنِّي لَا يَخَافُ لَدَيَّ الْمُرْسَلُونَ

"پھر جب اُس نے دیکھا کہ وہ (عصا) سانپ کی طرح حرکت کر رہا ہے تو وہ پیٹھ پھیر کر پلٹ گیا اور پیچھے مڑ کر نہ دیکھا۔ (اللہ نے فرمایا:) اے موسیٰ! نہ ڈر، میرے پاس رسول نہیں ڈرا کرتے"۔

(النمل) 10 :

یہ واقعہ اس حقیقت کی نشاندہی کرتا ہے کہ

عقیدۃً نبی بھی اللہ کے سوا کسی سے نہیں

ڈرتا، مگر فطری طور پر خوف ایک انسانی

ردِعمل ہے۔

اسی لیے شریعت نے انسان کے عمل میں

"استطاعت" کی قید لگائی، تاکہ دین انسان

کے لیے سہولت اور فطرت کے مطابق رہے۔

 خیرخواہی: عقیدۃً عالمگیر، عملاً استطاعت کے مطابق

اسلام میں خیرخواہی کا دائرہ عام ہے۔ نبی ﷺ نے فرمایا:

> الدِّينُ النَّصِيحَةُ

"دین سراسر خیرخواہی ہے"۔

(صحیح مسلم) 55 :

مگر خیرخواہی کے دو درجے ہیں:

1. عقیدۃً: مومن دل میں پوری انسانیت کے لیے خیرخواہ ہوتا ہے۔ وہ ہر قوم کے لیے دعا کرتا ہے، کیونکہ یہ اس کی استطاعت کے اندر ہے۔

2. عملاً: وہ صرف اسی دائرے میں خیرخواہی کر سکتا ہے جس کا وہ ذمہ دار یا نگران ہے۔

قرآن میں فرمایا:

> قُوا أَنفُسَكُمْ وَأَهْلِيكُمْ نَارًا

"اپنے آپ کو اور اپنے اہل کو آگ سے بچاؤ"۔

(التحریم 6) :

صحیح مسلم 997 میں ہے

> ایک موقع پر نبی کریم ﷺ کے سامنے ایک شخص کا معاملہ پیش ہوا، تو آپ

ﷺ نے خرچ کی ترتیب بیان فرماتے ہوئے

ارشاد فرمایا:

” اپنے آپ سے ابتدا کرو ، خود پر صدقہ

کرو ، اگر کچھ بچ جائے تو تمہارے گھر

والوں کے لیے ہے ، اگر تمہارے گھر والوں

سے کچھ بچ جائے تو تمہارے قرابت داروں

کے لیے ہے اور اگر تمہارے قرابت داروں سے

کچھ بچ جائے تو اس طرف اور اس طرف

خرچ کرو“۔

راوی نے کہا : آپ اشارے سے کہہ رہے

تھے کہ اپنے سامنے ، اپنے دائیں اور اپنے بائیں

خرچ کرو ۔

یعنی خیر کا آغاز اپنے اہل و عیال سے،

قریبی رشتے دار ، پڑوسی، اور اپنی رعیت سے

ہونا چاہیے۔

اسلامی سیاست میں ذمہ داری، عدل، اور حدودِ خیرخواہی

اسلامی سیاست اقتدار نہیں بلکہ خدمت اور عدل کا نام ہے۔

نبی ﷺ نے فرمایا:

> كُلُّكُمْ رَاعٍ وَكُلُّكُمْ مَسْؤُولٌ عَنْ رَعِيَّتِهِ

"تم میں سے ہر ایک نگہبان ہے اور ہر ایک سے اس کی رعیت کے بارے میں سوال کیا جائے گا"۔

(صحیح بخاری: 893، صحیح مسلم: 1829) :

اگر کوئی وزیراعظم یا حکمران ہے تو اس کی

عملی خیرخواہی پہلے اپنی قوم کے لیے ہوگی۔

اس کے بعد اگر استطاعت ہو تو پڑوسی

ممالک کے لیے بھی عدل و بھلائی کے ساتھ

خیرخواہی کرے۔

مگر افسوس آج بہت سے رہنما محب وطنی

کے نام پر بیرون ممالک کو نقصان پہنچاتے

ہیں — جو کہ خیرخواہی کے منافی ہے۔

یہ تو وہی بات ہوئی جیسے کوئی شخص اپنے

خاندان کے لیے حرام کمائی کرتا ہے، یعنی

کسی دوسرے کا نقصان پہنچا کر اپنے عزیزوں

کو فائدہ دیتا ہے۔

ایسا شخص بظاہر اپنے گھر والوں کا خیرخواہ

لگتا ہے مگر درحقیقت وہ سب کو نقصان

پہنچا رہا ہوتا ہے۔

اسی طرح جو حکمران اپنی قوم کو بیرون

ممالک کے نقصان پر وسائل دیتا ہے، وہ بھی

حقیقی خیرخواہی سے خالی ہے۔

اسلام کا پیغام اس کے برعکس ہے۔

قرآن کہتا ہے:

> وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَآنُ قَوْمٍ عَلَىٰٓ أَلَّا تَعْدِلُوا ۚ اعْدِلُوا هُوَ أَقْرَبُ لِلتَّقْوَىٰ ۖ وَاتَّقُوا اللَّهَ ۚ إِنَّ اللَّهَ خَبِيرٌ بِمَا تَعْمَلُونَ ۝

"کسی قوم کی دشمنی تمہیں انصاف سے نہ روکے۔ انصاف کرو، یہی تقویٰ سے قریب تر ہے، اور اللہ سے ڈرو، بے شک اللہ تمہارے اعمال سے باخبر ہے"۔

)المائدہ(8 :

یہی وہ اصول ہے جو اسلامی سیاست کو دیگر
نظریات سے ممتاز کرتا ہے — یعنی عدل کے
ساتھ خیرخواہی، نہ کہ تعصب کے ساتھ مفاد۔

یہی طرزِ فکر حضرت عمر بن الخطاب رضی
اللہ عنہ نے اپنی خلافت میں واضح کیا۔
میں نے ایک مستند عالمِ دین سے یہ تاریخی
واقعہ سنا کہ

ایک شخص مدینے سے باہر جا کر مویشیوں

کی خوراک (چارہ یا غلہ) خریدنا چاہتا تھا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

" >اگر تم سب کچھ خرید لو گے تو

مدینے والے کیا کھائیں گے"؟

یعنی مسلمان کی تجارت یا سیاست کا مقصد

صرف اپنا نفع نہیں بلکہ پوری قوم کی

بھلائی ہونا چاہیے۔

یہی وہ عملی توازن ہے جو اسلام نے فرد، قوم، اور انسانیت سب کے مفاد کے لیے قائم کیا ہے۔

📖 تعلیم و تعلم: سب سے بڑی خیرخواہی اور سیاست کی روح

اسلامی سیاست میں سب سے بڑی خدمت قرآن و حدیث کی تعلیم و تعلم ہے۔

یہی ذریعہ ہے جس سے عوام کی سوچ دنیاوی

محنت سے نکل کر اخروی کامیابی کی طرف

متوجہ ہوتی ہے۔

دنیا پرست انسان اگر نوکری کرتا ہے تو اسے

صرف دنیاوی سیلری ملتی ہے۔

لیکن جس کے دل میں قرآن و حدیث سے

ایمان پیدا ہو جاتا ہے، وہ سیلری کے ساتھ

اجرِ آخرت بھی پاتا ہے — کیونکہ اس کی

نوکری عبادت بن جاتی ہے۔

یہ کیفیت محض الفاظ سے نہیں آتی؛ دل میں اللہ سے امیدیں قرآن و حدیث کی تعلیم و تعلم سے ہی پیدا ہوتی ہیں۔

دل میں کوئی بٹن نہیں کہ جسے دبایا جائے اور امیدیں اللہ سے وابستہ ہو جائیں — یہ اثر صرف اس علم سے حاصل ہوتا ہے جو دل کو رب کی طرف جوڑ دے۔

نبی کریم ﷺ کا سیاسی مشن بھی یہی تھا:

> يُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ

"وہ انہیں کتاب اور حکمت سکھاتے ہیں".

آل عمران[164]

لہٰذا جو رہنما اپنی قوم میں قرآن و سنت کی تعلیم کو عام کرتا ہے، وہ دراصل سب سے بڑی سیاسی اور روحانی خدمت انجام دیتا ہے — کیونکہ وہ اپنی قوم کو صرف محدود خوشحالی نہیں بلکہ لازوال خوشحالی کا راستہ دیکھاتا ہے۔

🌿 اختتامیہ

اسلام کا پیغام یہ ہے کہ عقیدۃً مومن کا توکل کامل ہو، مگر عملاً وہ اپنی استطاعت کے مطابق مکلف ہے۔

موسیٰ علیہ السلام کا سانپ سے ڈرنا، اور نبی ﷺ کا عدل و خیرخواہی کا اسوہ — دونوں

یہی سکھاتے ہیں کہ ایمان اور فطرت میں

توازن ہی دین کا حسن ہے۔

خیرخواہی کا جذبہ دل میں تمام انسانیت کے

لیے ہونا چاہیے، اور عملی طور پر یہ انسان کی

استطاعت کے مطابق اپنے اہلِ عیال سے شروع

ہو کر رفتہ رفتہ تمام ممالک اور اقوام تک

پھیل سکتا ہے۔

سیاست، عبادت، اور خیرخواہی — تینوں اسی وقت بابرکت بنتے ہیں جب ان کی بنیاد عدل، تعلیم، اور سچی نیت پر ہو۔
یہی وہ توازن ہے جو ایک قوم کو دنیا میں باوقار اور آخرت میں کامیاب بناتا ہے۔

واللہ تعالیٰ اعلم

عالم برزخ میں رہنے والے کو پکارنا

وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنْ يَّدْعُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَنْ لَّا يَسْتَجِيْبُ لَهٗٓ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ وَهُمْ عَنْ دُعَآئِهِمْ غٰفِلُوْنَ ۞

وَاِذَا حُشِرَ النَّاسُ كَانُوْا لَهُمْ اَعْدَآءً وَّ كَانُوْا بِعِبَادَتِهِمْ كٰفِرِيْنَ ۞

(الاحقاف: 5، 6)

ترجمہ: اور اس سے بڑھ کر کون گمراہ ہوگا

جو اللہ کے سوا اسے پکارتا ہو جو قیامت کے

دن تک اس کا جواب نہ دے اور وہ ان

کے پکارنے سے غافل ہیں۔

اور جب لوگوں کو جمع کیا جائے گا تو وہ

ان کے دشمن ہو جائیں گے اور ان کی عبادت

سے منکر ہوں گے۔

اِلٰی یَوۡمِ الۡقِیٰمَۃِ

"قیامت کے دن تک اس کا جواب نہ دے"

کی قید لگائی گئی ہے۔

بت ہمیشہ جواب نہیں دے سکتے۔

اللہ کی مشیت کے بغیر بھی کوئی ہمیشہ

جواب نہیں دے سکتا۔

قریبی فرشتے اب بھی جواب دے سکتے ہیں،

جیسا کہ حدیث میں ہے کہ غائب بھائی کے

لیے دعا کرنے پر فرشتہ آمین کہتا ہے۔

زندہ انسان بھی اسباب کے ذریعے جواب دے

سکتے ہیں۔

لہٰذا، یہ آیت برزخی زندگی میں رہنے والوں

کے بارے میں ہے۔

مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ سے مراد مخلوق ہے۔

مطلب یہ ہے کہ گمراہی تو یہ بھی ہے کہ

کسی زندہ شخص سے عقلی و اختیاری امیدیں

وابستہ رکھی جائیں، لیکن اس سے بڑھ کر

گمراہ وہ ہوگا جو ایسے کو پکارے جو قیامت تک جواب نہ دے سکے۔

میری تحقیق کے مطابق، علماء کی دو اقسام ہیں:

1. وہ جو سمعِ موتیٰ کے بالکل قائل نہیں ہیں، اور ان کے نزدیک یہ راجح قول ہے تاکہ قبر پرستی کا راستہ روکا جا سکے۔

2. وہ جو صرف ان مقامات پر سمعِ موتیٰ کے قائل ہیں جہاں احادیث میں اس کا ذکر ہے۔ کیونکہ ان کے نزدیک عادۃً سنائی نہیں دیتا ہے ۔

اس کی مثال یوں دی جا سکتی ہے کہ ایک شخص عموماً بیرونِ ملک رہتا ہے لیکن کبھی کبھار پاکستان آتا ہے۔ جب وہ پاکستان آتا ہے، تب اس کا وہاں سننا ثابت ہوتا ہے،

لیکن جب وہ بیرونِ ملک ہوتا ہے، تو

پاکستان میں اس کا سننا ثابت نہیں ہوتا۔

یا کمپنی کی طرف سے خاص میسیجز آتے

ہیں جن کا یہ مطلب نہیں کہ ہر خبر

موصول ہوتی ہے ۔

میری ذاتی رائے کے مطابق، اس بحث کی

ضرورت نہیں ہے کیونکہ مذکورہ آیت کے

مطابق عادۃً غافل ہونا یقینی ہے۔ اب اگر

سنائی دیتا بھی ہو تو فائدہ کیا، جب وہ

غافل ہو؟ غفلت کی کئی وجوہات ہو سکتی ہیں: یا تو سنائی نہیں دیتا، یا متوجہ نہیں ہے، یا دور ہے۔

قبر کی زندگی میں رہنے والوں کو مجازی مدد کے لیے پکارنا صریح گمراہی ہے۔ اس پکار کو چاہے استغاثہ کا نام دے دیا جائے یا کوئی اور نام، اگلی آیت میں اسے عبادت قرار دیا گیا ہے۔

عبادت قرار دینے کی وجوہات:

1. ذاتی طور پر سننے اور باخبر ہونے کا دعویٰ – تاہم، چونکہ مشرکین انہیں اللہ کی مخلوق سمجھتے ہیں، اس لیے یہ وجہ کافی نہیں۔

2. کامل باخبر ہونا – جیسے کہ بیک وقت کئی پکاروں سے آگاہ ہونا، جو ایک کامل صفت پر دلالت کرتا ہے۔

3. باخبر ہونے کے سبب پر کوئی دلیل نہ ہونا – یعنی مافوق الاسباب باخبر ہونے کا دعویٰ کرنا۔

البتہ، اگر کوئی معجزاتی طور پر باخبر ہونے
کا دعویٰ کرے تو احتیاطاً شرک کا فتویٰ
نہیں لگایا جائے گا، لیکن اسے بدعتی قرار دیا
جائے گا، کیونکہ معجزے کے لیے ہر موقع پر
دلیل پیش کرنا ضروری ہوتا ہے۔

مثلاً، آگ کی ٹھنڈک کے ایک واقعے پر دلیل
پیش کرنا دیگر مواقع کے لیے کافی نہیں،
کیونکہ آگ عادۃً گرم ہوتی ہے۔ لہٰذا، آگ کی
ٹھنڈک کے ہر نئے واقعے کے لیے یا تو دلیلِ

ھدیٰ (شرعی دلیل) یا دلیلِ بدیہی (واضح اور

مشاہداتی دلیل) کی ضرورت ہوگی۔

اسی طرح نبی کریم ﷺ کا کسی ایک بات

سے معجزاتی طور پر باخبر ہونا، دیگر باتوں

سے باخبر ہونے کی دلیل نہیں بن سکتا۔

وَّ كَانُوْا بِعِبَادَتِهِمْ كٰفِرِيْنَ ۞

اگر عبادت سے انکار وہ کر رہے ہیں جنہیں

پکارا جاتا تھا، تو اس سے مزید واضح ہو

جاتا ہے کہ وہ غافل ہیں، جیسا کہ تاکید

کے طور پر کہا گیا۔

اور اگر عبادت سے پکارنے والے منکر ہیں، تو

اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اسے استغاثہ وغیرہ

کا نام دیتے تھے، یا پھر وہ اس نیت سے

عبادت نہیں کرتے تھے جس نیت سے اللہ کی

عبادت کرتے تھے۔ بلکہ وہ اللہ کی مخلوق

سمجھ کر سفارش کروانے کے لیے انہیں راضی

کرنے کی کوشش کرتے تھے، جسے اکثر لوگ

عبادت نہیں سمجھتے اور یہ عبادت اس لئے ہے

کیونکہ اس میں مافوق الاسباب باخبر ہونے کا

گمان ہوتا ہے۔

پہلا قول راجح ہے کہ جنہیں پکارا گیا، وہ

منکر ہوں گے۔ اس سے غفلت پر تاکید مراد

ہے کیونکہ یہ مسئلہ انتہائی اہم ہے، کیونکہ

شرک کی ابتدا بھی یہی سے ہوئی ہے۔ واللہ

تعالیٰ اعلم۔

نوٹ: دلیل کے متعلق:

معجزات سے استدلال کرنا ناقص طریقہ ہے۔

مثال کے طور پر، شریعت نے دھاگہ پہننا
حرام قرار دیا ہے، جبکہ مرہم کی پٹی باندھنا
جائز ہے، کیونکہ مرہم کی پٹی پر ایک بدیہی
دلیل موجود ہے۔ اللہ معجزے کے طور پر
دھاگہ پہننے سے بھی شفا دے سکتا ہے، لیکن
پھر بھی اسے حرام قرار دیا گیا ہے، کیونکہ
معجزاتی امکان کسی چیز کے حلال یا حرام
ہونے کا معیار نہیں بلکہ اس کا معمول کے
مطابق اثر دیکھنا ضروری ہوتا ہے۔

واللہ تعالیٰ اعلم

بغیرِ ظاہری سبب اور مافوق الاسباب کا تحقیقی جائزہ

مافوق الاسباب لغوی اعتبار سے ایسے تصرف کو کہا جاتا ہے جو اسباب و وسائل سے بالاتر ہو۔ یعنی فاعل کسی سبب یا وسیلے کا محتاج نہ ہو بلکہ براہِ راست فعل پر قادر ہو۔

معاصر زمانے کے بعض قبر پرست مشرکین یہ

مغالطہ دیتے ہیں کہ وہ عالمِ برزخ میں موجود

افراد سے "ماتحت الاسباب" مدد طلب کرتے

ہیں، یعنی انہیں اسباب اور ذرائع کی نوعیت

میں مانتے ہیں۔ حالانکہ حقیقت میں یہ ایک

فاسد تاویل ہے، کیونکہ ان کے دعوے کے

ثبوت میں کوئی معقول یا شرعی دلیل موجود

نہیں۔

اس مسئلے کی تفہیم کے لیے "بغیرِ ظاہری سبب" کی اصطلاح کو سمجھنا ناگزیر ہے۔ تاہم اس سے قبل دلیل کی اہمیت اور اس کی اقسام کا ادراک ضروری ہے، جس پر میں سابقہ مضامین میں مفصل بحث کر چکا ہوں۔

دلیل کی اہمیت کے لئے پہلے بیان ہو چکا ہے

۔

دلیل کی اقسام

اصولاً دلیل کی تین اقسام بیان کی جاتی ہیں:

1. عقلی دلیل: عقلِ صحیحہ پر مبنی دلائل۔
2. دلیلِ ہدیٰ: قرآن و حدیث سے مأخوذ نصوص۔

3. بدیہی دلیل: مشاہدے اور فطری ادراک پر مبنی دلائل۔

بدیہی دلیل میں یا تو سبب کا براہِ راست مشاہدہ کیا جاتا ہے، یا مسبب کے ذریعے سبب کا ادراک ہوتا ہے۔

مثال کے طور پر:

آگ کو دیکھ کر سبب کا مشاہدہ ہوتا ہے، اور کبھی دھواں دیکھ کر آگ کے وجود کا پتہ چلتا ہے۔

اسی طرح موبائل فون میں دیکھے جانے والے

اثرات سے معلوم ہوتا ہے کہ پسِ پردہ کوئی

سبب اور آلہ کار فرما ہے۔

اللہ تعالیٰ کا وجود اگرچہ براہ راست مشاہدے

میں نہیں آتا، لیکن کائنات کے آثار و

مخلوقات سے اللہ کی ذات کا ادراک بدیہی

طور پر ہوتا ہے۔

یہاں یہ امر قابلِ توجہ ہے کہ دعا کی قبولیت

بذاتِ خود سبب کے ثبوت پر دلالت نہیں

کرتی، کیونکہ مشرکین اور کفار کی دعائیں بھی

بعض اوقات (بظاھر) قبول ہو جاتی ہیں۔

بدیہی دلیل کے حصول کے لئے بعض اوقات

تجربات کیے جا سکتے ہیں، لیکن اس سے پہلے

یہ دیکھنا لازم ہے کہ کیا دلیلِ ہدیٰ (قرآن

و حدیث) میں اس تجربے کی ممانعت تو

وارد نہیں ہوئی؟

کیونکہ اصولاً دلیلِ ہدیٰ کو دلیلِ بدیہی پر

فوقیت حاصل ہے۔

مثلاً سورۃ الاحقاف، آیت نمبر 5 کے مطابق

عالمِ برزخ میں رہنے والے افراد، عالمِ دنیا کے

لوگوں کی پکار سے قیامت تک غافل ہیں۔

لہٰذا، اس امر میں کوئی تجربہ کرنا کہ آیا

وہ ہماری پکار سے باخبر ہوتے ہیں یا نہیں،

ازروئے قرآن ممنوع ہے اور بدیہی دلیل کے

ذریعے اس کا اثبات ممکن ضروری نہیں۔

مزید دلیل کے نکات پر تفصیلی مضمون

ملاحظہ کرنا ضروری ہے اس مضمون کے لئے

جو پہلے بیان ہو چکا ہے۔

بغیرِ ظاہری سبب کا مفہوم

جب کسی سبب کے ثبوت میں نہ دلیلِ ہدیٰ

موجود ہو اور نہ دلیلِ بدیہی، تو ایسے غیر

ثابت شدہ سبب کو "بغیرِ ظاہری سبب" کہا

جاتا ہے۔

اور جب بغیر کسی دلیل کے کسی ہستی سے

مدد طلب کی جائے تو مدد طلب کرنے والے

کے ذہن میں ناگزیر طور پر "مافوق الاسباب"

تصرف کا گمان پایا جاتا ہے۔

یہ بات اسی وقت معتبر ہوتی ہے جب کسی

ہستی سے مدد طلب کی جائے۔

بصورتِ دیگر، محض کسی مخلوق کے وجود یا

تاثیر کا ہمیں علم نہ ہونا بذاتِ خود مؤاخذہ

کا سبب نہیں بنتا۔

تاہم، جب کسی ہستی سے بغیر کسی شرعی یا

بدیہی دلیل کے مجازی مدد طلب کی جائے،

تو لازماً اس پر مافوق الاسباب تصرف اور

مافوق الاسباب علم کا گمان لازم آتا ہے۔

لہٰذا بغیر دلیل کے کسی مخلوق سے مجازی

مدد طلب کرنا بھی جائز نہیں، کیونکہ یہ

شرعی اصولوں کے خلاف ہے اور شرک کے

زمرے میں داخل ہونے کا خدشہ رکھتا ہے۔

دوسرے لفظوں میں

(یہ اصول اسی وقت محلِ اعتبار ہے جب کسی

مخلوق سے مدد طلب کی جائے۔

بصورتِ دیگر، ایسی ہستیوں کے وجود یا تاثیر

کے عدم ادراک پر کوئی مؤاخذہ مرتب نہیں

ہوتا۔

البتہ، جب کسی ہستی سے، جس کے تصرف

یا علم پر کوئی شرعی یا بدیہی دلیل موجود

نہ ہو، مجازی مدد طلب کی جائے تو لامحالہ

اس پر مافوق الاسباب تصرف اور علم کا

گمان لازم آتا ہے۔

اسی لئے بغیر دلیل کے کسی سے مجازی مدد

طلب کرنا شرعاً ممنوع ہے اور توحید کے منافی

شمار ہوتا ہے۔)

لہٰذا جب کسی سے مدد طلب کی جاتی ہے اور نہ کوئی شرعی دلیل ہوتی ہے اور نہ مشاہداتی قرائن، تو لازماً مافوق الاسباب قدرت کا اعتقاد لازم آتا ہے۔

مثال کے طور پر، چودہ سو سال قبل اگر کوئی شخص مشرق میں مقیم کسی زندہ انسان سے مغرب کے حالات دریافت کرتا، تو چونکہ اس وقت اس نوعیت کی اطلاع رسانی کے لیے کوئی معلوم ظاہری ذریعہ موجود نہ

تھا، اس لیے یہ مافوق الاسباب علم کا گمان

شمار ہوتا۔

لیکن عصرِ حاضر میں انٹرنیٹ اور مواصلاتی

ذرائع کی بدولت دنیا کے کسی بھی حصے کی

اطلاعات بآسانی حاصل کی جا سکتی ہیں، لہٰذا

اب اس قسم کے سوال و جواب کا تعلق

ماتحت الاسباب ذرائع سے ہے، اور مافوق

الاسباب گمان کا محل باقی نہیں رہا۔

قرآنی دلائل

قرآنِ مجید میں اس حقیقت کو واضح انداز میں بیان کیا گیا ہے۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

> وَمَنْ يَّدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ ۙ لَا بُرْهَانَ لَهٗ بِهٖ ۙ فَاِنَّمَا حِسَابُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ ؕ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الْكٰفِرُوْنَ ۝

(المؤمنون: 117)

ترجمہ:

"اور جو شخص اللہ کے ساتھ کسی اور معبود کو پکارتا ہے جس پر اس کے پاس کوئی دلیل نہیں، تو اس کا حساب اس کے رب ہی کے پاس ہوگا۔ بے شک کافر فلاح نہیں پائیں گے۔"

اس آیت کا سیاق واضح کرتا ہے کہ کسی کو الوہیت کا مقام دینے کے لیے مافوق الاسباب قدرت اور علم کا اثبات ضروری ہے۔

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے الوہیت کے استحقاق کے لیے مافوق الاسباب تصرف اور علم کو علت کے طور پر بیان کیا ہے، جس کی تفصیل میں نے علیحدہ مضمون "عبادت" میں پیش کی ہے، اسے ملاحظہ فرمائیں۔

پس جب کسی ہستی کے تصرف یا علم پر کوئی معتبر دلیل موجود نہ ہو، اور اس کے باوجود اس سے مدد طلب کی جائے، تو یہ اس ہستی کو الوہیت کا درجہ دینے کے مترادف ہے۔

کیونکہ ایسی مدد طلبی میں لاشعوری طور پر اس پر مافوق الاسباب تصرف اور علم کا گمان کیا جاتا ہے، جو درحقیقت شرکِ اکبر میں داخل ہونے کا موجب بنتا ہے۔

اسی طرحِ سورۃ الاحقاف (آیت 5) میں عالمِ برزخ کے رہنے والوں کی دنیاوی پکار سے عدمِ ادراک کو ثابت کیا گیا ہے، جس سے مزید وضاحت ہوتی ہے کہ ان سے مدد طلب کرنا مافوق الاسباب اعتقاد پر مبنی ہوتا ہے۔

خلاصہ

اہلِ علم کبھی کبھی "مافوق الاسباب" کی بجائے "بغیرِ ظاہری سبب" کی تعبیر استعمال کرتے ہیں۔

کیونکہ جب کسی ہستی سے بغیرِ ظاہری سبب کے مدد طلب کی جاتی ہے تو عملاً مافوق الاسباب قدرت اور علم کا گمان کیا جاتا ہے۔

اِلٰہَ = ایسا وجود جو بغیرِ ظاہری سبب کے علم اور تصرف رکھتا ہو۔ (عبادت کے دو قسم اور تمام ممکنہ اقسام پر مضمون لکھ چکا ہوں)

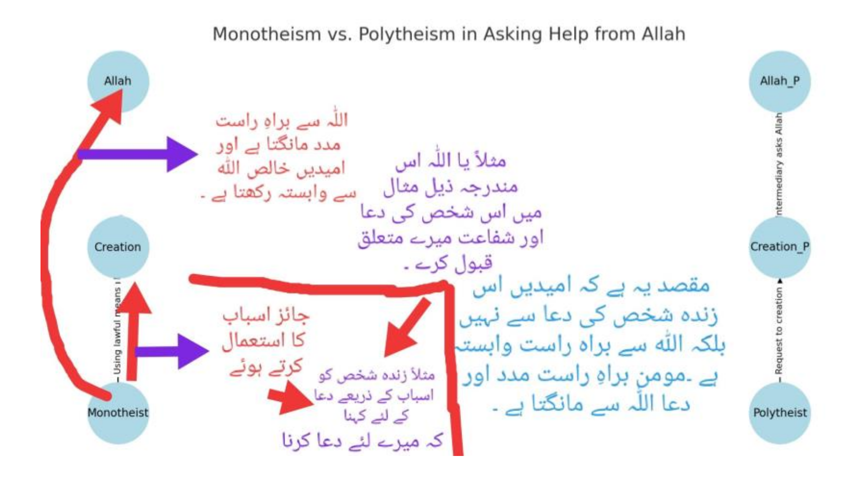
بغیرِ ظاہری سبب = جب سبب پر کوئی شرعی یا بدیہی دلیل موجود نہ ہو۔

مافوق الاسباب = سبب کے عدمِ ثبوت کے باوجود مدد طلب کرنا، جس میں مدعا پر

مافوق الاسباب قدرت اور علم کا گمان لازم آتا ہے۔

واللہ تعالی أعلم بالصواب۔

دعا اور عقلی اختیاری امیدیں براہِ راست اللہ سے:



اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے اور بندے کی دعاؤں کو سنتا اور قبول کرتا ہے۔ اس لیے دعا میں کسی بھی مخلوق کو واسطہ نہ بنایا

جائے کہ اللّٰہ اور بندے کے درمیان کوئی اور ہو۔ اللّٰہ تعالیٰ خود فرماتا ہے:

> "اور جب میرے بندے تم سے میرے متعلق پوچھیں، تو (کہہ دو کہ) میں قریب ہوں، میں پکارنے والے کی پکار کو قبول کرتا ہوں جب وہ مجھے پکارتا ہے، پس انہیں چاہیے کہ وہ میرا حکم مانیں اور مجھ پر ایمان لائیں تاکہ وہ ہدایت پائیں۔" (البقرۃ: 186)

اِیَّاكَ نَعْبُدُ وَاِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ ۝

ترجمہ: ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں، اور

تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں

واسطہ ختم کرنا اور براہِ راست دعا مانگنا:

نوٹ: اگر کوئی خود تمہیں دعا کرے تو یہ

براہِ راست اللہ سے دعا ہوتی ہے اور واسطے

میں نہیں آتی کیونکہ یہ اس کی اپنی دعا

ہے۔

لیکن جب کسی سے دعا کروانے کے لیے کہا

جائے تو واسطہ ختم کرنے کی کوشش کرے،

جیسے اندھے شخص کی دعا میں تھا: 'اے

اللہ! میرے حق میں ان (نبی ﷺ) کی دعا

قبول فرما۔' اس سے امید صرف اللہ سے

وابستہ رہتی ہے اور تمہاری دعا براہِ راست اللہ

سے ہو جاتی ہے۔ اس صورت میں دو دعائیں

ہوتی ہیں: ایک اس شخص کی جو تمہارے لیے

دعا کر رہا ہے اور ایک تمہاری جو دعا

کروانا چاہتے ہو۔ تمہاری جو دعا ہے، اسے براہِ

راست بنائے ۔

اسی طرح، قیامت کے دن نبی کریم ﷺ کی

شفاعت کے بارے میں بھی یہی طرزِ فکر ہونا

چاہیے کہ شفاعت اللہ کے حکم سے ہی ہوگی،

اس لیے دعا یوں ہو:

"اے اللہ! قیامت کے دن میرے حق میں خیر

و عافیت کے ساتھ نبی کریم ﷺ کی

شفاعت قبول فرما۔"

یا یوں کہے

"اے اللہ! قیامت کے دن اپنی رحمت سے مجھے نبی کریم ﷺ کی شفاعت میں شامل فرما۔"

اس سے دعا میں واسطہ ختم ہو جاتا ہے، اور امیدیں اللّٰہ سے وابستہ رہتی ہیں، نہ کہ کسی اور سے۔

رسول اللّٰہ ﷺ نے دعا کے براہِ راست اللّٰہ سے مانگنے کی تاکید کرتے ہوئے فرمایا:

جب تم کوئی چیز مانگو تو صرف اللہ سے

مانگو، جب تو مدد چاہو تو صرف اللہ سے

مدد طلب کرو

الترمذی – 2516

امام کے پیچھے آمین کہنا درحقیقت سورۃ

الفاتحہ کی دعا کو امام کے واسطے کے بغیر،

براہِ راست اللہ سے مانگنے کا اظہار ہے۔

چونکہ سورۃ الفاتحہ میں دعا موجود ہے (اھدنا

الصراط المستقیم وغیرہ)، اس لیے مقتدی کا

'آمین' کہنا اس بات کا اعتراف ہے کہ وہ بھی براہِ راست اللّٰہ سے یہی دعا مانگ رہا ہے، نہ کہ امام کو بطور واسطہ اختیار کر رہا ہے۔

یہ بات حدیث میں اشارۃً ملتا ہے:

> "جب امام (وَلَا الضَّالِّينَ) کہے تو تم کہو (آمین)، کیونکہ جس کی آمین فرشتوں کی آمین کے ساتھ مل جائے، اس کے پچھلے گناہ بخش دیے جاتے ہیں۔"

(صحیح بخاری: 780، صحیح مسلم: 410)

(لیکن امام کو بطور واسطہ عقیدةً بھی ختم کیا جا سکتا ہے اس لئے زبان سے امین کہنا مستحب ہے ۔ واللہ تعالیٰ اعلم)

دعا زبان سے ہی نہیں، نیت اور عقیدے سے بھی ہوتی ہے:

دعا صرف الفاظ سے نہیں بلکہ نیت اور عقیدے سے بھی کی جاتی ہے۔ عقیدے میں یہ شامل ہو کہ ہر مدد کی طلب خالص اللّٰہ سے

براہِ راست ہو۔ یہی عقیدہ "بسم اللّٰہ" پڑھنے

میں بھی پایا جاتا ہے۔

مثلاً:

جب پانی پینے سے پہلے "بسم اللّٰہ" کہا جاتا

ہے، تو اس میں یہ عقیدہ ہوتا ہے کہ برکت

اور فائدہ اللّٰہ ہی کے ہاتھ میں ہے۔

عقیدہ میں خفیہ طور پر براہِ راست دعا

شامل ہوتی ہے ۔

(پانی پیتے وقت "بسمِ اللہ" پڑھنے میں اگر دل و دماغ میں عقیدے کی حاضری نہ ہو تو یہ عبادت کہلاتی ہے، اور اگر عقیدے کی مکمل حاضری ہو تو یہ احسان کہلاتا ہے۔)

اگر کوئی عقیدۃً دعا میں یہ کہے: "اے اللہ! نبی کریم ﷺ کی شفاعت میرے حق میں خیر و عافیت کے ساتھ قبول فرما۔" تو اس طرح عقیدۃً واسطہ ختم ہو جائے گا اور امید صرف اللہ سے ہوگی، نہ کہ کسی اور سے۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

> "اگر تم سوال کرو تو اللہ ہی سے سوال کرو، اور جب مدد مانگو تو اللہ ہی سے مدد مانگو۔" (سنن الترمذی: 2516، حسن صحیح)

نیت میں دعا شامل ہوتی ہے:

جب کوئی اچھا کام کرے، اور اس میں نیت یہ ہو کہ اللہ کی رضا کے لیے کر رہا ہے، تو یہ اللہ کی رضامندی کی دعا مانگ رہا ہے

نیت سے اور یہ سب سے بڑی دعا ہے کیونکہ اللّٰہ کی رضامندی سے بڑھ کر کچھ نہیں کہا ۔ اگر نیت یہ ہو کہ اللّٰہ مال میں برکت دے، تو یہ بھی براہِ راست اللّٰہ سے برکت مانگنے میں شامل ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کا واقعہ اس کی بہترین مثال ہے، جب انہوں نے دو عورتوں کی خدمت کی اور اس کے بعد براہِ راست اللّٰہ سے دعا کی:

> "اے میرے رب! میں اس خیر کا جو تو مجھ پر نازل کرے، سخت محتاج ہوں۔"

(القصص: 24)

یہاں موسیٰ علیہ السلام نے نیکی (خدمت) کو وسیلہ بنایا، مگر ان کی امیدیں براہِ راست اللّٰہ سے تھیں، نہ کہ اپنی نیکی پر۔ نیکی دعا کے وقت موسیٰ اور اللّٰہ کے درمیان واسطہ نہیں تھا۔

اللّٰہ تعالیٰ فرماتا ہے:

> "بے شک اللّٰہ نیکی کرنے والوں کا اجر ضائع نہیں کرتا۔" (یوسف: 90)

اللّٰہ شکور ہے کہ اللّٰہ کے ہاں نیکی کی بے انتہا قدر ہے ۔

اس طرح سوچ کر اللّٰہ کی صفات پر نظریں ہوتی ہے نہ کہ اپنی نیکی پر کیونکہ نیکی اور عمل بھی مخلوق ہی ہے ۔

حاصل یہ کہ تمہارے اور اللّٰہ کے درمیان دعا میں مخلوق کا واسطہ نہ ہو۔

اس کے برعکس مشرکین کا نظریہ ہوتا ہے جو

علامات سے ظاہر ہے کہ اللّٰہ ہماری سنتا

(قبول) نہیں اور اس (مخلوق) کی رد نہیں

کرتا ہم اسے کہیں گے اور یہ اللّٰہ پر ہمارا

کام کروائے گا۔

دعا میں واسطہ بناتے ہیں۔

کہتے ہیں

"یہ ہمارے سفارشی ہیں اللّٰہ کے نزدیک۔"

(یونس – 18)

بظاہر مومن بھی دعا میں کسی وسیلے کا ذکر کر سکتا ہے، لیکن جیسا کہ اوپر وضاحت کی گئی، یہ وسیلہ درحقیقت براہِ راست اللّٰہ ہی سے امید رکھنے کی ایک صورت ہوتی ہے، نہ کہ کسی مخلوق کو حقیقی واسطہ بنانے کی۔ ظاہری واسطہ کو عقیدۃً اور نیت سے کیسے ختم کیا جاتا ہے اوپر مثالوں میں واضح کیا گیا ۔

(براہِ راست) دعا کے دو طریقے:

1. اسمائے حسنیٰ کے ذریعے دعا

جیسے: "یا اللّٰہ، یا الرحمن، یا غفور، یا رزاق وغیرہ۔"

"اور اللّٰہ کے اچھے اچھے نام ہیں، پس انہیں لے کر اس سے دعا کرو۔"

(سورۃ الأعراف: 180)

نوٹ: اللّٰہ کی صفات پر نظریں جمانا درحقیقت اللّٰہ ہی سے امید رکھنا ہے، کیونکہ اللّٰہ کی صفات اللّٰہ سے جدا اور غیر نہیں ہیں۔

2. نیک اعمال کو وسیلہ بنا کر دعا

جیسے:

"اے اللہ! میں تجھ سے اپنے ایمان کے وسیلے سے سوال کرتا ہوں۔"

"اے اللہ! میں نے تیری رضا کے لیے نماز پڑھی، اس کے ذریعے میری دعا قبول فرما۔"

اس طرح روزہ، صدقہ خیرات، خدمت خلق، اچھی بات، تجارت وغیرہ کو وسیلہ میں پیش کرکے براہِ راست مدد طلب کی جاتی ہے ۔

یہ نیکی کو وسیلہ بنانا حدیث سے ثابت ہیں، جیسا کہ غار میں پھنسے تین آدمیوں کا واقعہ، جنھوں نے اپنے نیک اعمال کو وسیلہ بنا کر دعا کی، اور اللّٰہ نے انہیں نجات دی۔ (صحیح بخاری: 2215، صحیح مسلم: 2743)

لیکن یہ واضح رہے کہ نیکی بھی مخلوق ہے

اور دعا میں مخلوق کو واسطہ نہ بنائے اگر

بن جائے تو عقیدۃً اور نیت کے ذریعے سے

ختم کرے جیسا کہ اوپر مثالوں میں واضح

کیا گیا اور نظریں اور امیدیں خالص اللہ سے

وابستہ رکھے ۔

اگر پھر بھی مشکل ہو تو "الحمد للّٰہ" کے

معنی پر خوب غور کرے۔

"الحمد للّٰہ" کا معنی ہے "تمام تعریفیں خاص

اللّٰہ ہی کے لئے ہیں" ۔

واللہ تعالیٰ اعلم

اللہ ہماری سنتا نہیں اور اس کی رد نہیں کرتا:

مشرکین کا نظریہ تھا کہ "اللہ ہماری سنتا نہیں اور اس کی رد نہیں کرتا"۔

"اللہ ہماری سنتا نہیں" میں ان کا گمان یہ تھا کہ اللہ نے کسی چیز کو نہ دینے کا

فیصلہ کر لیا ہے، اور اب وہ کسی مخلوق کے

وسیلے سے اللہ کے اس فیصلے کو بدل سکتے

ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ (نعوذ

باللہ) اللہ کے فیصلے کو کمزور سمجھتے تھے

اور کسی سفارش یا وسیلے کو فیصلہ بدلنے کا

ذریعہ مانتے تھے۔

اس کے برعکس ایک مومن کا عقیدہ یہ ہے

کہ وہ پہلے سے یہ فرض نہیں کرتا کہ اللہ

نے کسی چیز کو دینے یا نہ دینے کا فیصلہ

کر لیا ہے۔ بلکہ وہ اللہ سے یقین اور عزم کے ساتھ دعا کرتا ہے، جیسا کہ حدیث میں آتا ہے:

> "اللّٰہ سے دعا مانگو اور دعا میں یقین رکھو (کہ وہ قبول کرے گا)"

(سنن الترمذی: 3479، حسن)

یوں دعا نہیں کہ اللّٰہ نے نہ دینے کا فیصلہ ویسے بھی کیا پھر بھی مانگ ہی لیتا ہوں ۔ کیونکہ جب اللّٰہ پہلے ہی فیصلہ کر چکا ہو

کہ نہ دے، تو اس کے فیصلے کے خلاف

تبدیلی کی دعا کیسے کی جا سکتی ہے؟

لہٰذا، مومن کسی چیز کے متعلق پہلے سے یہ

طے نہیں کر لیتا کہ اللہ اسے نہیں دے گا،

بلکہ وہ دعا کرتا ہے اور یقین رکھتا ہے کہ

اللہ اسے دے سکتا ہے اور اللّٰہ الرحم الرحمین

ہے۔ مومن کسی وسیلے کو اللہ کے فیصلے کو

بدلنے کا ذریعہ نہیں سمجھتا، بلکہ وسیلہ

محض دعا کی قبولیت کے اسباب میں سے

ایک سبب ہوتا ہے، جیسا کہ شریعت میں جائز وسیلوں کا تصور پایا جاتا ہے۔

اسی طرح، جو فیصلے اللہ نے قطعی طور پر قرآن و حدیث میں بیان کر دیے ہیں، ان کے خلاف دعا کرنا درست نہیں۔ مثلاً، اگر کوئی شخص شیطان کے لیے مغفرت کی دعا کرے، تو یہ اللہ کے واضح فیصلے کے خلاف ہوگا، کیونکہ قرآن میں اللہ نے فرمایا:

> "یقیناً اللّٰہ نے اس پر لعنت فرمائی ہے"

(النساء: 117 –118)

ایسی دعا کرنا درحقیقت اللہ کے فیصلے کو کمزور سمجھنے کے مترادف ہوگا، جو ایک غلط نظریہ ہے۔

اس لئے دعا میں واسطہ کو ختم کیا جاتا ہے تاکہ اللّٰہ کے فیصلے کے سامنے انتہائی درجے کی عاجزی اور بے بسی کا اظہار ہو۔

نوٹ:

واضح رہے کہ ابراہیم علیہ السلام کا اپنے والد
کے لیے، اور نبی کریم ﷺ کا ابو طالب
کے لیے دعا کرنے کا نظریہ یہ تھا کہ انہوں
نے پہلے سے یہ فرض نہیں کیا تھا کہ ان
کی دعا قبول نہیں ہوگی، اور نہ ہی یہ
حقیقت کھل چکی تھی کہ یہ اللّٰہ کا اٹل
فیصلہ ہے جو کبھی نہیں بدلے گا۔

جبکہ مشرکین پہلے سے ہی انکار کو فرض کر
لیتے ہیں، پھر اس انکار کو کسی اور کی

سفارش کے ذریعے بدلنے کی کوشش کرتے ہیں۔

جو کہ اس بات کی عکاسی کرتا ہے کہ

مشرک اللّٰہ کو فیصلہ و حاکمیت میں کمزور

سمجھتا ہے ۔

یہی فرق ہے ابراہیم علیہ السلام اور مشرکین

کی دعا میں۔

واللہ تعالیٰ اعلم

عقیدہ ، عبادت اور احسان:

مومن کا عقیدہ ہوتا ہے کہ اللہ دیکھ رہا ہے ۔ پانی کے ذریعے پیاس اللہ بجھاتا ہے پانی میں خود اثر نہیں ہوتا ہے اور نہ مستقل ہے۔

جب مومن پانی پیتے وقت بسم اللہ پڑھے اور بعد میں الحمد للہ اور دل میں عقیدہ کی حاضری نہ ہو کہیں اور متوجہ ہو تو یہ عبادت کہلاتا ہے ۔

لیکن جب پانی پیتے وقت دل میں عقیدہ کی

حاضری بھی ہو کہ اللہ دیکھ رہا ہے تو یہ

احسان کہلاتا ہے جو عبادت کا اعلیٰ درجہ ہے۔

ساتھ میں لازوال اجر کی امید بھی رکھے۔

اللّٰہ محسنین کی اجر ضائع نہیں کرتا ۔

دنیا = محدود اجر / فانی اجر

آخرت = لازوال اجر

مسئلہ:

مومن کا جب پانی پیتے وقت خیال نہ بھی ہو

تو پھر بھی یہ مانا جائے گا کہ وہ براہِ

راست اللّٰہ سے پیاس بجھانا طلب کرتا ہے

کیونکہ مومن کا جو مذکورہ عقیدہ ہے اس

میں خفیہ طور پر براہِ راست دعا شامل ہے

اس وجہ سے مشرک نہیں ہوگا ۔

نوٹ:

عقلی اور اختیاری امید اور بھروسہ اللہ پر

کرنا ہے ۔ جذبات میں مخلوق سے بے اختیار

امید اور خوف آتا ہے—یہ قابلِ معافی ہے۔

واللہ تعالیٰ اعلم

انسان کی فطرت اور آسمانی علم:

انسان کی فطرت میں خود غرضی ، حرص،

خواہش شامل ہیں ۔

اللّٰہ انسان کو اپنی فطرت بدلنے کو نہیں کہتا
بلکہ آسمانی علم کو اپنی فطرت کے ساتھ
ملانے کو کہتا ہے یعنی جہالت کی مذمّت کرتا
ہے ۔
یہ انسانی فطرت جب جہالت کے ساتھ ہو تو
نقصان دہ ہے اور اگر آسمانی علم کے ساتھ ہو
تو فائدہ مند ہے ۔

اپنی خیر و بھلائی کے بارے میں فکرمند
ہونا خود غرضی کہلاتا ہے ۔

اپنے فائدے کے لئے دوسرے کا نقصان کرنے

کو عرف میں خود غرضی کہلاتا ہے ۔

قرآن و حدیث کبھی کبھار عرف کے مطابق

بات کرتا ہے۔ جن احادیث میں خود غرضی کی

مذمّت ہیں وہ عرف میں خود غرضی کی

مذمّت ہیں ورنہ اصل مذمت جہالت کی ہیں

کیونکہ عرف میں خود غرض انسان نے محدود

فائدے کو لازوال فائدے پر ترجیح دے دی

ہیں جو کہ اصل میں جہالت ہے نہ کہ خود

غرضی کیونکہ انسان اپنی فطرت کے خلاف گیا

ہے ۔ اور اللہ کا مطالبہ یہ ہے کہ اپنی

فطرت کے مطابق زندگی بسر کر یعنی اپنی

خیر و بھلائی کے بارے میں حریص بن جا۔

اسلام ایک فطرتی مذہب ہیں ۔ قرآن و

حدیث کے قوانین فطرت کے مطابق ہیں ۔

قرآن و حدیث خواہش ترک کرنے کا بھی

نہیں کہتا بلکہ کہتا ہے کہ اپنی خواہش قرآن

و حدیث کے تابع کر۔ کیونکہ تمہارا روح

جس چیز کے لئے تڑپتا ہے وہ اللہ کے قوانین

میں ہی ملے گا اس دنیا میں بھی اور آخرت

میں بھی۔

اسلام کے خلاف خواہشات جہالت کی وجہ سے

ہوتی ہے ۔

(اگر ہمیں پیغمبر جتنا آسمانی علم حاصل ہو

جائے تو ہم بھی اللّٰہ کی توفیق سے معصوم

بن جائیں گے ۔ واللہ تعالیٰ اعلم

غیر انبیاء کی فطرت مغفور بننا ہے نہ کہ

معصوم)

یوسف علیہ السلام کے متعلق بھی یہی کہا گیا

کہ اگر اس کے پاس براھین (آسمانی علم) نہ

ہوتا تو وہ بھی لغزش کر بیٹھتا۔

اس لئے اکیلے آسمانی علم ہی کافی ہے ، انسان

کی فطرت خود انسان کو عمل کرنے کے لئے

مائل کرے گا ۔

یہ کہنا درست نہیں کہ قرآن و حدیث کا

علم کافی نہیں ہے عمل بھی ضروری ہے ۔ یہ

بات مخلوق کی بنائی ہوئی کتابوں کے بارے

میں درست ہے ۔

البتہ قرآن و حدیث یعنی اللہ پر ایمان لانا

ضروری ہے کیونکہ آسمانی علم زیادہ تر پوشیدہ

باتوں کی خبر داری دیتا ہے جسے حاصل کرنے

اور یقین کرنے کے لئے اللہ پر اندھا اعتماد

کرنا ضروری ہے اور اسی کو ایمان باللہ کہتے

ہے۔

ضد و عناد (تکبر، حسد، تعصب ، شخصیت

پرستی اور اب و جد) کرنے والا شخص قرآن

و حدیث کا صحیح علم حاصل نہیں کر سکتا

ہے ۔ اور غلط علم جہالت کا ازالہ نہیں کرتا

پھر فطرت انسانی نقصان دہ ہوتی ہے ۔

(میری تحقیق کے مطابق ۔۔

فرشتوں نے انسان کی فطرت دیکھ کر نتیجہ

اخذ کیا کہ یہ تو ایک دوسرے کا خون

بہائیں گے ۔

تب اللہ تعالیٰ نے علم کا نمونہ پیش کیا جس میں مقصد آسمانی علم کی فضیلت دکھانا تھا۔ واللہ تعالیٰ اعلم)

فائدہ:

اگر تمہاری اولاد خود غرضی کی وجہ سے دوسروں کا نقصان کرتا ہے یا کوئی اور کبیرہ گناہ کرتا ہے تو علاج آسمانی علم ہے۔

اس لئے معرفت الٰہی پر جنت کی خوشخبری

سنائی گئی ہے ۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«مَنْ مَاتَ وَهُوَ يَعْلَمُ أَنَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ دَخَلَ

الْجَنَّةَ» . رَوَاهُ مُسلم

ترجمہ: "جس شخص کو اس حالت میں موت

آئے کہ وہ جانتا ہو کہ اللہ کے سوا کوئی

معبود برحق نہیں تو وہ جنت میں داخل ہو

گا۔"

منافق لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللہ کی روحِ تک نہیں پہنچ سکتا ہے کیونکہ اس میں اللّٰہ کی باتوں پر اندھا اعتماد کرنا ضروری ہے ۔ یعنی ایمان باللّٰہ ضروری ہے ۔

نکتہ:

لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللہ کے سیکھنے اور سکھانے میں خوب محنت کرے ، اعمال صالحہ کی فضا (اللّٰہ کے فضل و رحم سے) اپنا آپ پیدا ہو جائے گی ۔

واللہ تعالیٰ اعلم

آسمانی علم اور حقیقی نیکی

دنیا کہتی ہے کہ انسان کو بغیر کسی سبب کے مہربان ہونا چاہیے، بلا وجہ نیکی کرنی چاہیے، اور یہی اعلیٰ اخلاق ہیں۔

لیکن انسان کی فطرت میں ایسی "بلا وجہ نیکی" سرے سے موجود نہیں۔

انسان ہمیشہ پوچھتا ہے:

"میں کیوں معاف کروں؟ کیوں باز آ جاؤں؟

کیوں کسی پر رحم کھاؤں؟"

عقل سبب مانگتی ہے، اور یہی وہ مقام ہے

جہاں وحی انسان کی رہنمائی کرتی ہے۔

قرآن و حدیث نیکی کی ایسی مضبوط وجوہات

پیش کرتے ہیں جو جذبات پر نہیں بلکہ

یقین پر مبنی ہیں۔

قرآن کہتا ہے کہ نرمی، درگزر، اور رحم کے

پیچھے آخرت کی حقیقت ہے —

جہنم سے نجات،

جنت کا حصول،

اللہ کا دیدار،

دل کا اطمینان،

اور یہ یقین کہ اللہ کی طاعت ہی وہ اصل کرنسی ہے جس سے دنیا و آخرت دونوں کا رزق حاصل ہوتا ہے۔

یوسف علیہ السلام کا قصہ بھی یہی سچائی بیان کرتا ہے:

> "وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهِ وَهَمَّ بِهَا لَوْلَا أَنْ رَأَى بُرْهَانَ رَبِّهِ"

یعنی اگر وہ اپنے رب کی دلیل نہ دیکھتے تو وہ بھی مائل ہو جاتے۔

یہ ‘‘برہانِ رب’’ یعنی آسمانی علم ہی وہ روشنی ہے جو انسان کو گناہ سے بچاتی اور خیر کی طرف مائل کرتی ہے۔

دہریہ کی ظاہری وجوہات اور مومن کی معرفت

آج دہریہ اور دنیا پرست لوگ بھی نیکی کی ترغیب دیتے ہیں۔

مثلاً ایک تصویر میں دکھایا جاتا ہے کہ ایک

بچہ پودے کو پانی دیتا ہے،

اور بڑھاپے میں وہی درخت اسے سایہ دیتا

ہے۔

گویا نیکی کا محرک یہ بتایا جاتا ہے کہ

"کبھی نہ کبھی یہی فائدہ تمہیں واپس ملے

گا۔"

یہ وجوہات وقتی اور سطحی ہیں۔

ایسی نیکی دیرپا نہیں رہتی، کیونکہ یہ محدود

مفاد پر مبنی ہے —

اور جب نفس کی خواہش، بیوی بچوں کی

ضرورت، یا دنیاوی دباؤ آتا ہے تو یہ تمام

فلسفے ٹوٹ جاتے ہیں۔

انسان اتنی معمولی منفعت کے لیے مستقل طور

پر عمل نہیں کر سکتا۔

مؤمن بھی نیکی میں مفاد دیکھتا ہے — لیکن

اس کا مفاد محدود نہیں، لازوال ہے۔

اسے اللہ کی معرفت حاصل ہوتی ہے، اس لیے

وہ صرف دنیا کے وقتی فائدے پر نظر نہیں

رکھتا بلکہ آخرت کے دائمی اجر پر نظریں

جماتا ہے۔

یہی عقلمندی ہے کہ انسان اپنے مفاد کے لیے

فنا کے بجائے بقا کو چنے،

اور محدود کے بجائے ابدی کو ترجیح دے۔

ایمان اور اندھا اعتماد

اصل عقل مندی یہ ہے کہ انسان اللہ کی

باتوں پر اندھا اعتماد کرے —

کیونکہ اللہ نے جو وعدے کیے ہیں، وہ بظاہر

تجربات کے خلاف دکھائی دیتے ہیں۔

جب انسان ظاہری فائدہ نہیں دیکھتا تو وہ

عمل میں کمزور ہو جاتا ہے۔

لیکن ایمان انسان کو اس کمزوری سے بچاتا

ہے۔

مؤمن کہتا ہے: "اگر اللہ نے وعدہ کیا ہے تو وہی سچ ہے، چاہے میرا مشاہدہ کچھ اور دکھائے۔"

یہی ایمان کا کمال ہے، جو نیکی کو استقامت بخشتا ہے۔

فطرت اور خود غرضی

انسان کی فطرت خود غرض ہے — وہ ہمیشہ

اپنی بھلائی چاہتا ہے۔

اسلام اس فطرت کو مٹانے نہیں آیا، بلکہ

اسے سنوارنے آیا ہے۔

قرآن انسان سے یہ نہیں کہتا کہ اپنی بھلائی

کا خیال چھوڑ دو،

بلکہ یہ کہتا ہے: "اپنی بھلائی کے طالب بنو،

مگر دائمی بھلائی کے۔"

جو اپنی فطرت کے مطابق اپنے لیے خیر چاہتا

ہے، وہ لازوال خیر کا طالب بن جاتا ہے،

اور یہی ایمان کا راستہ ہے۔

انسان کی مذمت اس کی خود غرضی پر نہیں،

بلکہ اس کی جہالت پر کی جاتی ہے —

کہ وہ سمجھتا ہے دوسرے کا نقصان اس کا

فائدہ ہے،

حالانکہ یہ محض نظروں کا دھوکا ہے۔

وحی کی ضرورت

یہی مقام ہے جہاں آسمانی علم کی ضرورت

ظاہر ہوتی ہے۔

اگر وحی نہ ہو تو انسان کے پاس نیکی کا

کوئی پائیدار سبب باقی نہیں رہتا۔

اس کی عقل محدود مشاہدے تک قید رہتی

ہے،

اور جب وہ مشاہدہ فائدہ نہ دکھائے تو نیکی

بے معنی بن جاتی ہے۔

وحی انسان کو وہ علم عطا کرتی ہے جو

مشاہدے سے آگے دیکھنے کی طاقت دیتا ہے

—

وہ یقین کہ نیکی کا پھل ہمیشہ دیر سے

مگر لازماً ملتا ہے۔

یہی علم انسان کو عارضی جذبے سے نکال کر

ابدی یقین کی راہ پر لے آتا ہے،

جہاں نیکی احساس نہیں، عبادت بن جاتی ہے۔

دہریہ کا غلط فہم

جب دہریہ دیکھتا ہے کہ ایک مؤمن بغیر

دنیاوی مفاد کے نیکی کرتا ہے،

تو وہ مظہر پرستی کا شکار ہو کر سمجھتا ہے

کہ اس نے "بلا وجہ مہربانی" کی۔

حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ مؤمن کا مفاد سب

سے بڑا مفاد ہے —

اللہ کی رضا، جو سب سے اعلیٰ اجر ہے۔

اور جب مؤمن کبھی دنیاوی معاوضہ نہیں لیتا،

تو وہ دراصل اللہ کے حکم پر عمل کرتا ہے

—

نہ کہ بلا وجہ۔

نتیجہ

پس، انسان کی فطرت میں "بغیر وجہ نیکی"

ناممکن ہے۔

لیکن وحی انسان کو بہترین وجہ عطا کرتی ہے

—

جو نہ ختم ہونے والی ہے، نہ کمزور ہونے

والی۔

مؤمن نیکی اس لیے کرتا ہے کہ وہ جانتا ہے:

> "إِنَّ اللَّهَ اشْتَرَى مِنَ الْمُؤْمِنِينَ أَنفُسَهُمْ وَأَمْوَالَهُم بِأَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ"

(اللہ نے مومنوں سے ان کی جانیں اور مال

خرید لیے، بدلے میں جنت دے کر۔)

یہی آسمانی علم انسان کو وہ بصیرت عطا

کرتا ہے

جو ظاہری وجوہات سے بلند کر کے نیکی کو

عبادت بنا دیتا ہے۔

واللہ تعالیٰ اعلم

علم غیب اللہ کی خصوصیت ہے

اَمۡوَاتٌ غَيۡرُ اَحۡيَآءٍ ۚ وَمَا يَشۡعُرُوۡنَ اَيَّانَ يُبۡعَثُوۡنَ

(النحل: 21)

ترجمہ: ”بے جان ہیں، زندہ نہیں ہیں، اور

انہیں خبر نہیں کہ کب اٹھائے جائیں گے۔“

نکتہ:

آیت کے اندازِ بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ

قیامت کے وقت کا علم، علمِ غیب کے لیے

ایک بنیادی اور ادنیٰ شرط ہے۔

مثلاً، اگر کوئی شخص دعویٰ کرے کہ وہ
بیٹسمین ہے، تو اس کے جھوٹے ہونے کو
ثابت کرنے کے لیے یہ کہنا کافی ہوگا: "تم تو
ایک اننگز میں ففٹی بھی نہیں بنا سکتے،
خاک بیٹسمین ہو!" (ادنیٰ شرط سے نفی کی
گئی)

لیکن یہ کہنا کہ "تم تو ایک اننگز میں
ہزار رنز نہیں بنا سکتے" غلط دلیل ہوگی،

کیونکہ ہزار رنز نہ بنانا بیٹسمین ہونے کے

منافی نہیں۔

اسی طرح، اگر کوئی شخص علمِ غیب کا

دعویٰ کرے، تو سب سے پہلے اس سے قیامت

کے وقت کا علم پوچھے۔ کیونکہ جب یہ نہیں

معلوم تو علم غیب کا دعویٰ غلط ہے ۔

مذکورہ بالا آیت کے اندازِ بیان میں غور

کریں ۔

دلائل:

1. حدیثِ جبریل کے مطابق نبی کریم ﷺ کو بھی قیامت کا وقت معلوم نہیں تھا۔

(صحیح بخاری: 50، صحیح مسلم: 9)

2. قرآن میں بارہا ذکر ہوا ہے کہ قیامت کا علم صرف اللہ کے پاس ہے:

إِنَّ ٱللَّهَ عِندَهُۥ عِلۡمُ ٱلسَّاعَةِ... (لقمان: 34)

قُلۡ إِنَّمَا عِلۡمُهَا عِندَ رَبِّي... (الاعراف: 187)

اجماعِ امت:

قیامت کے وقت کا علم اللہ کے سوا کسی کو نہیں۔ مخلوق اس سے بے خبر ہے، اور اس پر تمام صحابہ اور علماء کا اتفاق ہے۔

لہٰذا دیگر آیات اور احادیث کی طرح اس آیت سے بھی واضح ہوتا ہے کہ علم غیب اللّٰہ کی خصوصیت ہے۔

واللہ تعالیٰ أعلم۔

اللّٰہ شکور و قدردان:

وَقَالُوا الۡحَمۡدُ لِلّٰهِ الَّذِىۡۤ اَذۡهَبَ عَنَّا الۡحَزَنَ ؕ اِنَّ رَبَّنَا لَغَفُوۡرٌ شَكُوۡرُ ۞

ترجمہ: (فاطر - 34)

اور وہ (جنتی) کہیں گے کہ سب تعریف اللہ ہی کے لیے ہے جس نے ہم سے غم کو دور فرما دیا۔ بلاشبہ ہمارا رب بڑا بخشنے والا ہے خوب قدر دان ہے،

اِنَّا كُنَّا مِنۡ قَبۡلُ نَدۡعُوۡهُ ؕ اِنَّهٗ هُوَ الۡبَرُّ الرَّحِيۡمُ ۞

ترجمہ: (الطور - 28)

(اور جنتی کہیں گے) بلاشبہ ہم پہلے اس سے دعائیں مانگا کرتے تھے، بیشک وہ بڑا محسن ہے مہربان ہے

وَّاَنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۞

ترجمہ: (آل عمران - 171)

بلاشبہ اللہ ضائع نہیں فرماتا مومنین کے اجر کو۔

وَاصۡبِرۡ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيۡعُ اَجۡرَ الۡمُحۡسِنِيۡنَ ۝

ترجمہ: (هود - 115)

اور آپ صبر کیجئے کیونکہ اس میں شک

نہیں کہ اللہ اچھے کام والوں کا اجر ضائع

نہیں فرماتا۔

اِنَّهٗ مَنۡ یَّتَّقِ وَیَصۡبِرۡ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا یُضِیۡعُ اَجۡرَ الۡمُحۡسِنِیۡنَ ۞

ترجمہ: (یوسف - 90)

بلاشبہ بات یہ ہے کہ جو شخص تقویٰ اختیار کرے اور صبر کرے تو اللہ نیکی کرنے والوں کا اجر ضائع نہیں فرماتا۔

وَمَا کَانَ اللّٰهُ لِیُضِیۡعَ اِیۡمَانَکُمۡ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِالنَّاسِ لَرَءُوۡفٌ رَّحِیۡمٌ ۞

ترجمہ: (البقرہ – 143)

اور اللہ ایسا نہیں ہے کہ ضائع کرے تمہارے ایمان کو۔ بیشک اللہ لوگوں کے ساتھ بڑا مشفق مہربان ہے۔

وَمَا تُقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ مِّنْ خَيْرٍ تَجِدُوْهُ عِنْدَ اللّٰهِ هُوَ خَيْرًا وَّاَعْظَمَ اَجْرًا ؕ وَاسْتَغْفِرُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝

ترجمہ: (المزمل – 20)

اور جو نیک عمل تم اپنے لئے آگے بھیجو گے اس کو خدا کے ہاں بہتر اور صلے میں بزرگ تر پاؤ گے اور خدا سے بخشش مانگتے رہو۔ بیشک خدا بخشنے والا مہربان ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے ایک حدیث قدسی میں فرمایا:

اللہ تعالیٰ نے نیکیاں اور برائیاں مقدر

کردی ہیں اور پھر انہیں صاف صاف بیان

کردیا ہے۔ پس جس نے کسی نیکی کا ارادہ

کیا لیکن اس پر عمل نہ کرسکا تو اللہ

تعالیٰ نے اس کے لیے ایک مکمل نیکی کا

بدلہ لکھا ہے اور اگر اس نے ارادہ کے بعد

اس پر عمل بھی کرلیا تو اللہ تعالیٰ نے اس

کے لیے اپنے یہاں دس گنا سے سات سو گنا

تک نیکیاں لکھی ہیں اور اس سے بڑھ کر

اور جس نے کسی برائی کا ارادہ کیا اور پھر

اس پر عمل نہیں کیا تو اللہ تعالیٰ نے اس

کے لیے اپنے یہاں نیکی لکھی ہے اور اگر اس

نے ارادہ کے بعد اس پر عمل بھی کرلیا تو

اپنے یہاں اس کے لیے ایک برائی لکھی ہے۔

حوالہ: صحیح بخاری – 6491

واللہ تعالیٰ اعلم

حاکم، احسان اور حسن ظن

تمہید:

ایمان کی اصل بنیاد یہ ہے کہ انسان اللہ کو اپنا اکیلا حاکم مانے، اس کی نگرانی کا احساس رکھے، اور اس کے فیصلوں پر حسنِ ظن قائم رکھے۔ یہی وہ ایمان ہے جو دل کو سکون، عمل کو اخلاص، اور انجام کو عزت بخشتا ہے۔

لقمان — 22

وَمَنۡ يُّسۡلِمۡ وَجۡهَهٗۤ اِلَى اللّٰهِ

"جو شخص اللہ کو اکیلا حاکم مانتا ہے"

وَهُوَ مُحۡسِنٌ

"اور اس حال میں ہے کہ وہ یہ عقیدہ رکھتا

ہے کہ اللہ اسے غفور و شکور کی نظر سے

دیکھ رہا ہے، اللہ نیکوکاروں کا اجر ضائع نہیں

کرتا، بلکہ اس کی محکومیت کا بدلہ اپنی

غفور و شکور صفات کے مطابق دے گا،

کوتاہیوں کو معاف فرمائے گا اور نیکیوں کا

لازوال اجر عطا کرے گا۔

فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰىؕ وَاِلَى اللّٰهِ عَاقِبَةُ

الْاُمُوْرِ ۞

"تو اس نے مضبوط دستاویز تھام لی، اور سب

امور کا انجام اللہ ہی کی طرف ہے۔"

پھر جب اہلِ جنت اس بدلے (یعنی غفور و شکور کی شان کے مطابق ملنے والے بدلے) کو دیکھیں گے تو کہیں گے:

وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیٓ اَذْهَبَ عَنَّا الْحَزَنَ ۭ اِنَّ رَبَّنَا لَغَفُوْرٌ شَكُوْرُ ۞

"سب تعریف اللہ ہی کے لیے ہے جس نے ہم سے غم کو دور کر دیا، بے شک ہمارا رب بڑا بخشنے والا اور خوب قدردان ہے۔"

فاطر — 34

خلاصہ:

جو شخص اللہ کو اکیلا حاکم مان کر اپنے
آپ کو اس کے سپرد کر دے، نیکی کے راستے
پر ثابت قدم رہے اور اپنے رب سے اچھا
گمان رکھے، وہ دراصل مضبوط رسی کو تھام
لیتا ہے۔ ایسے ہی لوگوں کے لیے مغفرت،
لازوال اجر اور ابدی کامیابی ہے۔

۔۔۔

واللہ تعالیٰ اعلم

تقدیر کا صحیح اور غلط استعمال:

ہم تقدیر کی حقیقت مکمل طور پر نہیں
جانتے، لیکن جیسے کوئی شخص موبائل فون

کے اندرونی نظام کو سمجھے بغیر بھی اسے

درست طریقے سے استعمال کرنا سیکھ سکتا ہے،

اسی طرح تقدیر کو پوری طرح جانے بغیر

بھی اس کے مطابق صحیح طرزِ عمل اپنانا

ممکن ہے۔

تقدیر کا غلط استعمال

قرآن میں اللہ تعالیٰ نے کفار کے ایک غلط عقیدے کا ذکر کیا ہے کہ وہ اچھی اور بری تقدیر کی نسبت کس طرح کرتے تھے:

وَإِنْ تُصِبْهُمْ حَسَنَةٌ يَّقُوْلُوْا هٰذِهٖ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۚ وَإِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ يَّقُوْلُوْا هٰذِهٖ مِنْ عِنْدِكَ ۭ قُلْ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۭ

(النساء - 78)

"اور اگر انہیں کوئی بھلائی پہنچتی ہے تو کہتے ہیں: یہ اللہ کی طرف سے ہے، اور اگر

کوئی برائی پہنچتی ہے تو کہتے ہیں: یہ آپ
کی وجہ سے ہے۔ کہہ دیجیے: سب کچھ اللہ
کی طرف سے ہے۔"

کفار جب کسی خوشحالی میں ہوتے تو کہتے
کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے، لیکن اس کا
مقصد اللہ کا شکر ادا کرنا نہیں بلکہ نبی
کریم ﷺ اور آپ کے ساتھیوں کو اجر و
شرافت سے محروم سمجھنا ہوتا تھا۔ اور جب
کوئی مصیبت آتی تو اس کا الزام نبی ﷺ

اور آپ کے ساتھیوں پر ڈال کر انہیں منحوس

قرار دیتے۔

جبکہ تقدیر کا صحیح استعمال یہ ہوتا کہ

مصیبت کے وقت اپنے گناہوں کا اعتراف کرتے،

جیسا کہ اگلی آیت میں اللہ نے اس کی

وضاحت کی:

مَآ أَصَابَكَ مِنۡ حَسَنَةٍ فَمِنَ ٱللَّهِ وَمَآ أَصَابَكَ

مِن سَيِّئَةٍ فَمِن نَّفۡسِكَ ۚ

(النساء - 79)

"تمہیں جو بھلائی پہنچے، وہ اللہ کی طرف سے ہے، اور جو برائی پہنچے، وہ تمہارے اپنے نفس کی طرف سے ہے۔"

تقدیر کو بہانہ بنانا

اللہ تعالیٰ نے کفار کے ایک اور غلط عقیدے کا ذکر کیا کہ وہ اپنی گمراہی کو تقدیر کا بہانہ بنا کر جواز پیش کرتے تھے:

وَقَالَ ٱلَّذِينَ أَشۡرَكُواْ لَوۡ شَآءَ ٱللَّهُ مَا عَبَدۡنَا مِن دُونِهِۦ مِن شَيۡءٖ نَّحۡنُ وَلَآ ءَابَآؤُنَا وَلَا حَرَّمۡنَا مِن دُونِهِۦ مِن شَيۡءٖۚ

(النحل - 35)

"اور مشرکین کہتے ہیں: اگر اللہ چاہتا تو ہم اس کے سوا کسی چیز کی عبادت نہ کرتے، نہ ہم اور نہ ہمارے باپ دادا، اور نہ ہی ہم کسی چیز کو اس کے بغیر حرام قرار دیتے۔"

یہاں کفار نے اللہ کی مشیت کو اس کی رضا کے مترادف قرار دے کر اپنی گمراہی کا جواز بنایا، جبکہ اللہ نے واضح فرمایا:

وَلَا يَرْضٰى لِعِبَادِهِ الْكُفْرَ

(الزمر – 7)

"اور وہ اپنے بندوں کے لیے کفر کو پسند نہیں فرماتا۔"

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کی مشیت کا

یہ مطلب نہیں کہ وہ کفار کے شرک سے

راضی ہے ۔

قارون کی مثال اور تکبر میں تقدیر کا غلط

استعمال

قَالَ اِنَّمَآ اُوْتِيْتُهٗ عَلٰى عِلْمٍ عِنْدِیْ ؕ

(القصص - 78)

"اس نے کہا: یہ (مال و دولت) تو مجھے میرے علم کی بنا پر دیا گیا ہے جو میرے پاس ہے۔"

یہ قارون کا تکبر تھا کہ اس نے اپنی دولت کو اللہ کی عطا ماننے کے بجائے اپنی قابلیت اور علم کا نتیجہ قرار دیا۔ جبکہ تقدیر کا صحیح استعمال یہ ہوتا کہ انسان ہر نعمت کو اللہ کی طرف منسوب کرے اور خود اپنی

تعریف کے بجائے اللہ کی حمد کرے، جیسا

کہ اوپر سورۃ النساء (79) میں بیان کیا گیا۔

تم اور تمہارا عمل، دونوں مخلوق ہیں،

وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ وَمَا تَعْمَلُوْنَ

ترجمہ: "اور اللہ نے تمہیں اور جو عمل تم

کرتے ہو، سب کو پیدا کیا ہے۔"

(الصافات 37:96)

اس لیے خود کی اور اپنے عمل کی تعریف

کرنے کے بجائے اللہ کی حمد و ثنا کرو۔

یوں کہو: "بے شک اللہ نیکوکاروں کے اجر کو ضائع نہیں کرتا۔" جیسا کہ یوسف علیہ السلام نے فرمایا:

إِنَّهُ مَنْ يَتَّقِ وَيَصْبِرْ فَإِنَّ اللَّهَ لَا يُضِيعُ أَجْرَ الْمُحْسِنِينَ

ترجمہ: "بے شک جو کوئی تقویٰ اور صبر اختیار کرے تو یقیناً اللہ نیکوکاروں کا اجر ضائع نہیں کرتا۔"

(یوسف 12:90)

تقدیر کا مزید استعمال:

1. تقدیر کے واسطے تدبیر ترک نہ کرے

انسان کو تدبیر اور کوشش ترک نہیں کرنی چاہیے، کیونکہ اللہ نے دنیا میں اسباب اختیار کرنے کا حکم دیا ہے۔ حدیث میں آتا ہے:

انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "اگر قیامت

تم میں سے کسی پر قائم ہو جائے اور اس

کے ہاتھ میں ایک پودا ہو، تو اگر وہ اسے

لگا سکتا ہو تو ضرور لگائے۔"

حوالہ: مسند احمد (حدیث: 12902)

درجہ: صحیح (الارناؤوط کے مطابق)

مسند احمد 12436 (اسلام ون ایپ)

یہ اس بات کی علامت ہے کہ حالات جیسے

بھی ہوں، بندے کو اپنی کوشش جاری رکھنی

چاہیے اور تقدیر کا بہانہ بنا کر عمل چھوڑنا

درست نہیں۔

2. تدبیر اور تقدیر ساتھ ساتھ

قرآن میں حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنے

بیٹوں کو نظرِ بد سے بچنے کے لیے تدبیر

اختیار کرنے کی نصیحت کی تھی:

"میرے بیٹو! ایک دروازے سے داخل نہ ہونا بلکہ مختلف دروازوں سے داخل ہونا۔" (یوسف 12:67)

لیکن ساتھ ہی یہ بھی فرمایا کہ تدبیر پر بھروسہ مت کرو، اصل توکل اللہ پر کریں۔

3. تدبیر میں میانہ روی اختیار کرے

انسان کو چاہیے کہ وہ تدبیر کرے لیکن اس

میں اعتدال رکھے، یعنی نہ تو حد سے زیادہ

اسباب استعمال کرے اور نہ ہی بالکل چھوڑ

دے۔ تقدیر اور تدبیر ایک ساتھ چلتے ہیں،

اور بہترین راستہ یہی ہے کہ انسان اپنی بساط

بھر کوشش کرے اور اللہ پر مکمل عقلی

اختیاری بھروسہ رکھے۔

البتہ اعلیٰ درجے کا توکل بھی ممکن ہے،

بشرطیکہ وہ خالصتاً اللہ پر ہو۔

ابن ملیکہ رحمہ اللہ علیہ کے زمانے میں ایک

شخص بغیر زادِ راہ کے حج کے لیے روانہ ہوتا

تھا اور اسے توکل سمجھتا تھا۔ ابنِ ملیکہ

سمجھ گئے کہ وہ توکل کے حقیقی مفہوم سے

ناواقف ہے۔ چنانچہ ابن ملیکہ نے اس سے

کہا: "تم جماعت کے بغیر، اکیلے سفر کرو۔"

اس نے جواب دیا: "میں ایسا نہیں کر

سکتا۔"

تب ابن ملیکہ نے فرمایا: "پھر یہ نہ کہو

کہ میرا توکل اللہ پر ہے، بلکہ حقیقت میں

تمہارا بھروسہ جماعت پر ہے کہ وہ شرم کے مارے تمہاری ضروریات پوری کرے گی۔

4. توکل اور اخلاص کے وقت اپنے عمل کو کچھ حیثیت نہ دے، بلکہ مکمل بھروسہ اللہ پر رکھے۔ لیکن جب تدبیر اور اجتہاد کا موقع ہو، تو عمل کی بہتری اور خرابی کو تجربے اور بصیرت کی روشنی میں پرکھے۔

5. آدم علیہ السلام نے بھول کر میوہ کھانے کے بعد تقدیر کا سہارا لینے کے بجائے اپنی

لغزش کا اعتراف کیا اور اللہ سے معافی مانگی۔

لیکن جب موسیٰ علیہ السلام اور آدم علیہ السلام کے مکالمے میں حضرت موسیٰ نے ان سے جنت سے نکلنے کا ذکر کیا، تو آدم علیہ السلام نے اس مصیبت کو تقدیر کا حصہ قرار دیا۔

النساء (78) اور اس میں فرق یہ ہے کہ:

جب مصیبت آئے اور دوسروں کو الزام دینے کا

خیال آئے، تو خود کو موردِ الزام ٹھہراؤ۔

لیکن جب کوئی نعمت چھن جائے اور دل

مغموم ہو، تو آدم علیہ السلام کی طرح تقدیر

کا سہارا لے کر صبر کرو۔

واللہ تعالیٰ اعلم

—

إِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيعُ أَجْرَ الْمُحْسِنِينَ

(بے شک اللہ تعالیٰ نیکوکاروں کا اجر ضائع نہیں کرتا۔)

اس آیت کا ایک لطیف نکتہ یہ ہے کہ جب بندہ نیکی یا صبر کے بعد دنیا میں کوئی راحت یا کامیابی پاتا ہے، تو دل میں یہ خیال ابھرتا ہے کہ شاید اللہ نے اسی کا بدلہ عطا فرما دیا۔ ایسے وقت میں اس آیت کی تلاوت دل کو یاد دلاتی ہے کہ اللہ کا اجر

دنیا کی وقتی راحتوں تک محدود نہیں ہوتا۔

اس کا بدلہ بلند، بے زوال اور ابدی ہے —

کیونکہ اللہ کی شان اس سے کہیں اعلیٰ ہے کہ

وہ اپنے محسن بندے کو صرف دنیاوی کامیابی

پر راضی کر دے۔

واللہ تعالیٰ اعلم

—

اللّٰہ، حاکم اور حکیم: تقدیر اور اس کا استعمال

تقدیر کے حقیقی معاملات ہمارے علم میں نہیں، لیکن اس کے عملی استعمال کو ہم جان سکتے ہیں۔ میں اس پر پہلے ہی تفصیلی مضامین لکھ چکا ہوں۔

1) اللّٰہ بطور حاکم

اگر تقدیر کو اس نقطۂ نظر سے دیکھا جائے کہ اللّٰہ "حاکم" ہے، تو اس کا مطلب یہ ہوگا

کہ حلال و حرام ازخود مقرر نہیں، بلکہ اللّٰہ

کے خودمختار فیصلے سے متعین ہوتے ہیں۔

مثال کے طور پر، عام حالات میں بچے کو

قتل کرنا حرام ہے کیونکہ اللّٰہ نے اسے حرام

قرار دیا ہے۔ لیکن حضرت ابراہیم علیہ السلام

کے واقعے میں اللّٰہ نے انہیں اپنے بیٹے کی

قربانی کا حکم دیا، جو اس مخصوص موقع پر

جائز تھا۔

2) اللّٰہ بطور حکیم

اگر تقدیر کو اس نقطۂ نظر سے دیکھا جائے

کہ اللّٰہ "حکیم" ہے، تو اس کا مطلب ہوگا

کہ اللّٰہ نے حلال و حرام کی خبر دی ہے،

یعنی اعمال میں حسن و قباحت پہلے سے

موجود تھی، البتہ حسن و قباحت کا خالق اللّٰہ

ہی ہے۔ (حسن و قباحت کا مفہوم کسی خارجی

اصول سے نہیں بلکہ اللّٰہ کے تخلیقی نظام سے

جڑا ہوا ہے۔)

اس زاویے سے دیکھا جائے تو اسلامی شریعت

فطرت کے عین مطابق ہے، کیونکہ اللّٰہ نے جو

کچھ بھی حکم دیا، وہ انسانی فطرت کے

تقاضوں سے ہم آہنگ ہے۔

تقدیر اور اس کا استعمال

یہ دونوں نقطۂ نظر بذاتِ خود تقدیر کی

تعریف نہیں، بلکہ تقدیر کے استعمال کے

طریقے ہیں۔ تقدیر میں واضح حقیقت یہ ہے

کہ ہر اچھی اور بری تقدیر اللّٰہ کی طرف سے

ہے، اور وہی ان کا خالق ہے۔ لیکن تقدیر کی

تفصیلات متشابہات میں سے ہیں، یعنی ان کی

مکمل حقیقت کا ادراک انسانی عقل سے باہر ہے۔

قرآن و حدیث میں ہمیں تقدیر کا تصور سکھایا گیا ہے، اور یہ واضح کیا گیا ہے کہ "تقدیر" اور "تقدیر کا استعمال" دو الگ موضوعات ہیں، جنہیں ایک دوسرے سے الگ رکھنا ضروری ہے۔

خلاصہ:

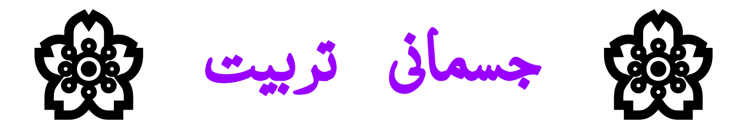
اللّٰہ کا ہر حکم حکمت پر مبنی ہے، مگر اس کی حقیقت ہمارے علم میں نہیں۔ کیونکہ اللّٰہ نے بے شمار ممکنات میں سے ایک خاص تقدیر اور اندازہ منتخب فرمایا ہے، جبکہ نہ ہمیں ان تمام ممکنات کا ادراک حاصل ہے، نہ ہم ان میں سے کسی کا انتخاب کر سکتے ہیں، اور نہ ہی ہم کسی مناسب اور برحق انتخاب کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

واللہ تعالیٰ اعلم

تربیتِ ربانی اور حاکمیتِ الٰہی

اللہ تعالیٰ نے انسان کو محض پیدا نہیں کیا
بلکہ اُس کی جسمانی اور روحانی تربیت کا
نظام خود قائم فرمایا — یہی ربوبیت ہے۔
ربوبیت کا مطلب صرف رزق دینا نہیں بلکہ
زندگی کے ہر نظام میں اللہ کی حاکمیت کو

ماننا اور اسی کے فیصلوں میں تربیت تلاش کرنا ہے۔



جسمانی تربیت

اللہ تعالیٰ ماں باپ کے دل میں محبت اور شفقت ڈال دیتا ہے تاکہ وہ بچے کی کمزوری میں بھی اس کی پرورش کریں۔

یہ محبت دراصل ربوبیتِ الٰہی کا مظہر ہے۔

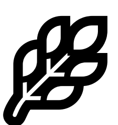
اسی طرح رزق، صحت، تعلیم، ٹیکنالوجی —— سب بواسطہ تربیتِ ربانی کے ذرائع ہیں۔ یہ سب ظاہری اسباب ہیں، مگر دراصل اللہ ہی مسبّبُ الاسباب ہے —— یعنی وہی جو تمام سببوں کے پیچھے اصل اثر پیدا کرتا ہے۔

> وَمَا مِن دَابَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللَّهِ رِزْقُهَا

(ھود: 6)

یعنی جسمانی تربیت بھی اللہ کے نظام کا حصہ ہے۔

روحانی تربیت — حاکمیت کی بنیاد



روحانی تربیت کا مطلب ہے کہ انسان اپنی زندگی کے تمام فیصلوں، قوانین اور اقدار میں صرف اللہ کو حاکم مانے۔

وحی اسی روحانی تربیت کا سرچشمہ ہے، جیسا کہ فرمایا:

> تَنْزِيلٌ مِّن رَّبِّ الْعَالَمِينَ

(واقعہ: 80)

یہ قرآن ربّ العالمین کی طرف سے اترا —

یعنی اللہ خود اپنی مخلوق کی تربیت فرما رہا

ہے۔

موسیٰ علیہ السلام اور مومنِ آلِ فرعون

کی دلیل

جب مومنِ آلِ فرعون نے کہا:

> أَتَقْتُلُونَ رَجُلًا أَن يَقُولَ رَبِّيَ اللَّهُ؟

(المؤمن: 28)

”کیا تم ایک شخص کو صرف اس لیے قتل کرتے ہو کہ وہ کہتا ہے میرا رب اللہ ہے؟“

تو اس ”رب“ کے معنی محض ”پالنے والے“ نہیں تھے، بلکہ حاکم اور قانون دینے والے کے تھے۔

فرعون کو اصل اعتراض یہی تھا کہ موسیٰؑ
نے حاکمیت اللہ کے لیے خاص کر دی ہے۔

اسی لیے فرعون نے طنزیہ کہا:

> وَمَا رَبُّ الْعَالَمِينَ؟

”یہ ربّ العالمین آخر ہے کون؟“

(الشعراء: 23)

اور اپنے اقتدار کا جواز یوں پیش کیا:

> أَلَيْسَ لِي مُلْكُ مِصْرَ وَهَٰذِهِ الْأَنْهَارُ تَجْرِي مِن تَحْتِي؟

(الزخرف: 51)

”کیا مصر کی بادشاہی میری نہیں؟ اور یہ نہریں جو میرے زیرِ حکم بہہ رہی ہیں؟“

یہ اس کا معاشی کنٹرول اور قانونی اقتدار دکھانے کا اعلان تھا — یعنی وہ ربوبیت (قانون سازی) کا مدعی تھا، خالق ہونے کا

نہیں بلکہ حاکم اور تربیت دینے والے ہونے کا۔

 ربوبیت کا مفہوم: قانون، فیصلہ اور تربیت

اس کائنات میں جو کچھ ہوتا ہے، وہ اللہ کے فیصلے سے ہوتا ہے۔

چاہے سوڈیم اور کلورین مل کر نمک بنیں یا

سورج نکلے — یہ سب فیصلے اللہ کے ہیں۔

اگر کوئی ان فیصلوں کو غیر اللہ کی طرف

منسوب کرے تو وہ حقیقت میں اسی کو

حاکم مان رہا ہے۔

اسی طرح زنا، سود، ظلم یا عدل —

یہ سب اللہ کے طے شدہ فیصلوں میں تربیت

رکھتے ہیں۔

اگر کوئی غیر اللہ کے قانون کو حق سمجھ

کر مانتا ہے، تو وہ اللہ کی صفتِ حاکمیت

میں شریک ٹھہراتا ہے، اور یہ کفر ہے۔

اور اگر غیر اللہ کے قانون کو صرف عملی

کمزوری کے باعث مانتا ہے، لیکن دل میں

اسے حق نہیں سمجھتا، تو یہ گناہ ہے۔

مخلوق کی حاکمیت حقیقی نہیں بلکہ مجازی

ہے؛ مخلوق کا حکم اسی وقت مانا جاتا ہے

جب وہ ﷲ کے حکم کے مطابق ہو، اور

ایسی اطاعت دراصل اللہ ہی کی اطاعت ہوتی

ہے — جیسے بیوی اپنے شوہر کی اطاعت اللہ

کے حکم کی وجہ سے کرتی ہے۔ جیسا کہ

سورہ یوسف میں ارشاد ہے:

إِنِ الْحُكْمُ إِلَّا لِلّٰهِ (یوسف: 40)

یعنی ’حکم صرف اللہ ہی کا ہے۔

اللہ کے فیصلے معلوم کرنے کے دو بنیادی

طریقے ہیں:

(1)

دلیلِ ہدیٰ — یعنی قرآن و حدیث سے

حاصل کردہ رہنمائی،

اور

(2)

دلیلِ بدیہی — یعنی تجربات اور مشاہدات

سے معلوم ہونے والی حقیقتیں۔

اللہ نے دلیل کی اہمیت پر بہت زور دیا ہے؛

اسی مقصد کے لیے پیغمبر مبعوث کیے گئے۔

جو شخص جان بوجھ کر اللہ پر جھوٹ باندھے

اور یہ کہے کہ ‘یہ اللہ کا فیصلہ ہے’ حالانکہ

وہ جانتا ہو کہ اللہ کا فیصلہ یہ نہیں، تو

اس کے لیے جہنم کی وعید ہے۔ البتہ اجتہادی

خطا معاف ہے اور اللہ کا فیصلہ معلوم کرنے

کی کوشش پر اجر بھی ہے۔

دلیل کی تفصیل اور مراتب پر میں ایک الگ

مضمون لکھ چکا ہوں، ملاحظہ فرمائیں۔

📖 قرآن و حدیث — تربیتِ ربانی کے معیار

نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

> بیشک اللہ اس کتاب (قرآن) کے ذریعے قوموں کو بلند فرماتا ہے اور اسی کے ذریعے بعض کو پست کر دیتا ہے۔

(صحیح مسلم: 817)

یہی قرآن وہ "رسی" ہے جو انسان کو اوپر لے جاتی ہے:

> وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللَّهِ جَمِيعًا وَلَا تَفَرَّقُوا

(آل عمران: 103)

جو اسے تھام لیتا ہے وہ بلندی (جنت) پاتا ہے، اور جو چھوڑ دیتا ہے وہ زوال (جہنم) میں گرتا ہے۔

انکارِ آخرت = ربوبیت کا انکار

اللہ نے فرمایا:

> وَإِن تَعْجَبْ فَعَجَبٌ قَوْلُهُمْ أَإِذَا كُنَّا تُرَابًا أَإِنَّا لَفِي خَلْقٍ جَدِيدٍ ۗ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ كَفَرُوا بِرَبِّهِمْ

(الرعد: 5)

یہ آیت واضح کرتی ہے کہ آخرت کا انکار

دراصل ربوبیت کے انکار سے پیدا ہوتا ہے۔

یہ لوگ کہتے ہیں: "ہم مٹی ہو جائیں تو

دوبارہ کیسے جی اٹھیں گے؟"

یعنی وہ مانتے ہیں کہ اللہ خالق ہے، مگر یہ

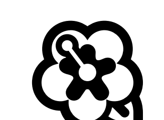
نہیں مانتے کہ وہ آج بھی تربیت دینے والا

اور فیصلوں کا مالک ہے۔

اگر وہ ربوبیت تسلیم کرتے تو لازماً جنت و

جہنم کو مانتے — کیونکہ تربیت اور تربیت

کی محرومی کا لازمی نتیجہ جزاء و سزا ہے۔

 ربنا اللّٰہ — اصل تربیت کا مرکز

> إِنَّ الَّذِينَ قَالُوا رَبُّنَا اللَّهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلَائِكَةُ

(فصلت: 30)

یہ آیت بتاتی ہے کہ "ربنا اللہ" کہنا صرف

عقیدہ نہیں بلکہ فیصلہ، قانون، تربیت، اور

حاکمیت میں اللہ کو تسلیم کرنا ہے۔

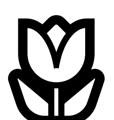
اسی لئے قبر میں پہلا سوال ہوگا: من ربک؟

یعنی زندگی میں تم نے کس کو حاکم، مربی،

فیصلہ کرنے والا مانا؟

کافر اس سوال کا جواب نہیں دے پائے گا

— کیونکہ اس نے حقیقت چھپائی۔

 تربیتِ ربانی — جنت اور جہنم کی راہ

اللہ کے فیصلوں میں تربیت ہے۔

جو ان فیصلوں کو قبول کرتا ہے، وہ اعلیٰ

تربیت پاتا ہے اور جنت میں داخل ہوتا ہے۔

اور جو انکار کرتا ہے، وہ تربیتِ ربانی سے

محروم ہو کر جہنم میں جاتا ہے۔

اسی لئے فرمایا:

> وَالَّذِينَ صَبَرُوا ابْتِغَاءَ وَجْهِ رَبِّهِمْ

(الرعد: 22)

"اور وہ لوگ صبر کرتے ہیں اپنے رب کی رضا کے لیے۔"

یعنی رب کی تربیت کو حاصل کرنے کے لئے۔

🤲 مومن کی دعا — تربیت میں آسانی

> رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهِ

(البقرہ: 286)

یہ دعا ظاہر کرتی ہے کہ مومن تربیتِ ربانی کو قبول تو کرتا ہے، مگر عقلمندی کی وجہ سے اللہ سے درخواست کرتا ہے کہ وہ تربیت اس کے لئے آسان بنا دے۔

اللہ کی تربیت میں مغفرت اور اجرِ لازوال ہے۔

اللہ تعالیٰ نے جنتیوں کا مقولہ قرآن میں نقل کیا ہے:

اِنَّ رَبَّنَا لَغَفُوۡرٌ شَكُوۡرٌ

(ترجمہ: بے شک ہمارا رب بخشنے والا اور قدردان ہے۔)

فاطر - 34

یہ بات وہ اُس وقت کہیں گے جب وہ اپنی

پوری زندگی کی ربانی تربیت کا نتیجہ اپنی

آنکھوں سے دیکھ لیں گے۔

وہ اعتراف کریں گے کہ واقعی ہمارے رب کی

تربیت میں مغفرت بھی تھی اور شکر و انعام

کا سلسلہ بھی۔

لہٰذا دنیا میں جب رب کی طرف سے تربیت

آئے — چاہے وہ کسی تکلیف، آزمائش یا دیر

سے ملنے والی خیر کی صورت میں ہو — تو

اسے ظلم نہ سمجھو۔

اللّٰہ کبھی ظلم نہیں کرتا؛ بلکہ ہر دکھ، ہر

آزمائش اور ہر تاخیر کے پیچھے مغفرت اور

لازوال اجر پوشیدہ ہوتا ہے۔

جو بندہ اللّٰہ کی تربیت کو خلوص کے ساتھ

قبول کرتا ہے، وہ آخرت میں یہی کہے گا:

”بے شک ہمارا رب بہت بخشنے والا اور قدر

دان تھا۔“

—

خلاصہ

ربوبیت کا مطلب صرف جسمانی پرورش نہیں
بلکہ ﷲ کی حاکمیت، فیصلوں اور تربیت کو
ماننا ہے۔

یہی ”ربنا اللّٰہ“ کا حقیقی مفہوم ہے۔

جو اسے مانتا ہے، وہ آسمانی تربیت کے ذریعے
جنت تک بلند ہوتا ہے۔

اور جو غیر اللہ کو حاکم مان کر حقیقت چھپاتا ہے، وہ ربوبیت کا منکر بن کر لازوال خسارے میں پڑتا ہے۔

ہم ساری زندگی للہ کی ربوبیت کا اعتراف کرنے پر مکلف ہیں۔

واللہ تعالیٰ اعلم

—

دنیاوی تعلیمی نصاب و تربیت — ایک فکر انگیز جائزہ

اسلام نے ہمیشہ کسبِ حلال اور قوت و
استعداد حاصل کرنے کی ترغیب دی ہے۔ نبی
کریم ﷺ نے فرمایا کہ "اللہ تعالیٰ اُس
ہاتھ کو پسند فرماتا ہے جو محنت سے کمانے
والا ہو"۔ اسی طرح قرآن میں مسلمانوں کو
قوت حاصل کرنے کی تلقین کی گئی تاکہ

دشمنانِ دین (محاربین) محض مسلمانوں کی

طاقت دیکھ کر فساد سے باز رہیں۔

یہی وجہ ہے کہ دنیاوی تعلیم اگر صحیح

مقصد کے تحت ہو تو یہ کسبِ معاش اور

قوتِ امت دونوں کے لیے اہم ترین ذریعہ بن

سکتی ہے۔

لیکن افسوس کہ موجودہ دنیاوی نصاب اور اس

کی تربیت کا نظام اس مقصد سے بہت دور

جا چکا ہے۔ پاکستان میں جو نصاب رائج ہے،

وہ صرف اُن چند طلبہ کے لیے سازگار ہے جن

کا حافظہ غیر معمولی طور پر تیز ہے۔ ایسے

ذہین طلبہ ہزار میں بمشکل ایک ہوتے ہیں،

جب کہ باقی اکثریت محض رٹا لگا کر وقت

ضائع کرتی ہے۔ نتیجتاً اُن کی فطری صلاحیتیں

دب جاتی ہیں اور وہ علم کے حقیقی ثمرات

سے محروم رہ جاتے ہیں۔

اسلامی نقطۂ نظر سے ہر انسان کو اُس کی

فطری صلاحیتوں کے مطابق تربیت دینا ضروری

ہے۔ مگر موجودہ نظامِ تعلیم ایک ایسا سانچہ

بن چکا ہے جس میں سب کو زبردستی فٹ

کیا جاتا ہے۔ جو فٹ نہیں ہوتا، اُسے ناکام

قرار دے دیا جاتا ہے۔ یہی ناکامی بعد میں

احساسِ کمتری، مایوسی، اور غلط راستوں کی

طرف لے جاتی ہے۔

مزید برآں، یہ نظام اتنا مصروف اور مغلوبِ

وقت ہے کہ طلبہ کو قرآن و حدیث کی

تعلیم کے لیے وقت ہی نہیں ملتا۔ وہ محض

امتحانات، نمبروں، اور اسناد کے پیچھے بھاگتے
رہتے ہیں۔ یوں وہ نہ دین حاصل کر پاتے
ہیں، نہ دنیا۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ وہ اپنی
ضروریات پوری کرنے کے لیے حرام ذرائع کی
طرف مائل ہو جاتے ہیں۔

قرآن و حدیث انسان کی روحانی تربیت کرتے
ہیں، جبکہ موجودہ دنیاوی نصاب صرف ذہنی
دباؤ پیدا کرتا ہے۔ جب روحانی تربیت ختم ہو
جائے تو انسان کے پاس (دنیاوی) علم تو رہتا

ہے مگر شعور نہیں، تعلیم تو ہوتی ہے مگر

تربیت نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج کا پڑھے

لکھے انسان کو (دنیاوی) علم تو ہے مگر کردار

نہیں، قابلیت تو ہے مگر امانت نہیں۔

وقت کا تقاضا ہے کہ ہم اپنے نصابِ تعلیم

پر از سرِ نو غور کریں۔ ایسا نظام قائم کیا

جائے جس میں دین اور دنیا دونوں کا توازن

ہو — جہاں ایک ہاتھ میں کتابِ الٰہی ہو

اور دوسرے ہاتھ میں دنیا کی مہارت۔ کیونکہ

صرف وہی تعلیم انسان کو سربلند کر سکتی ہے جو روح کو پاکیزگی اور زندگی کو مقصد عطا کرے۔

واللہ تعالیٰ اعلم

—

دینی اور دُنیاوی تعلیم کا اتحاد

انسان کی کامیابی صرف اس کے ذہن کے علم

میں نہیں، بلکہ اس کے دل کے نور میں

ہے۔

دین اور دنیا دونوں انسان کے ضروری پہلو

ہیں — ایک روح کی غذا ہے اور دوسرا

جسم کا سہارا۔

مگر جب یہ دونوں ایک دوسرے سے جدا کر

دیے جائیں تو انسان ادھورا رہ جاتا ہے۔

اسلام نے کبھی بھی دنیا سے منہ موڑنے کا حکم نہیں دیا۔

قرآنِ کریم میں فرمایا گیا ہے:

> وَابْتَغِ فِيمَا آتَاكَ اللَّهُ الدَّارَ الْآخِرَةَ وَلَا تَنسَ نَصِيبَكَ مِنَ الدُّنْيَا

"جو کچھ اللہ نے تجھے دیا ہے، اس سے آخرت تلاش کر، اور دنیا میں سے اپنا حصہ مت بھول۔" (القصص: 77)

یعنی دین اور دنیا دونوں اللہ کی نعمتیں ہیں،

اور دونوں میں انصاف اور توازن ضروری ہے۔

افسوس، آج ہم نے تعلیم کو دو حصوں میں

تقسیم کر دیا ہے —

ایک وہ جو مسجد و مدرسے تک محدود ہے،

اور دوسری وہ جو اسکول و یونیورسٹی تک

بند ہے۔

پہلی میں روح کی پرورش ہوتی ہے مگر دنیا

سے بے تعلقی پیدا کر دی جاتی ہے،

اور دوسری میں دنیا سکھائی جاتی ہے مگر

روح سے تعلق توڑ دیا جاتا ہے۔

نتیجہ یہ کہ نہ روح مطمئن رہتی ہے، نہ

زندگی منور۔

حقیقت یہ ہے کہ اسلام نے ہر علم کو

عبادت کا درجہ دیا ہے —

اگر نیت خالص ہو اور مقصد اللہ کی رضا۔

خالی دنیا کا علم، اگر خدا سے کٹا ہو، تو

فتنہ بن جاتا ہے۔

اور صرف دین کا علم، اگر دنیا کے عمل

سے جڑا نہ ہو، تو اپنا اثر کھو دیتا ہے۔

دینی اور دنیاوی تعلیم کا اتحاد یہی ہے کہ

انسان اپنے علم کو خدمت اور ہدایت دونوں

کا ذریعہ بنائے۔

طبیب بن کر مریض کی جان بچائے، مگر

نیت اللہ کی رضا ہو۔

انجینئر بن کر عمارت تعمیر کرے، مگر

جذبہ یہ ہو کہ یہ بھی صدقۂ جاریہ ہے۔

استاد بن کر ذہن روشن کرے، مگر ساتھ ساتھ

دلوں کو بھی جگائے۔

یہ اتحاد تب ہی ممکن ہے جب ہمارا تعلیمی

نظام قرآن و سنت کے اصل مقاصد پر قائم

ہو۔

جہاں ہر مضمون انسان کو اللہ کے قریب

کرے،

اور ہر علم اسے انسانیت کی خدمت کا پیغام

دے۔

دین اور دنیا ایک ہی سفر کے دو قدم ہیں

—

جب یہ دونوں مل کر چلیں تو انسان صرف

پڑھتا نہیں، بدل جاتا ہے۔

اور جب انسان بدل جائے تو معاشرہ بھی

روشن ہو جاتا ہے۔

یہی وہ تعلیم ہے جہاں علم، عمل بن جاتا

ہے؛

اور عمل، عبادت کا درجہ پا لیتا ہے۔

واللہ تعالیٰ أعلم

—

اہل کتاب اور بدعت: ایک فکری تجزیہ

اسلام میں "اہل کتاب" کی اصطلاح یہود و نصاریٰ کے لیے استعمال کی جاتی ہے، کیونکہ وہ آسمانی کتابوں کو مانتے ہوئے، اپنے گمان کے

مطابق ان کے احکام پر عمل کرتے ہیں،

اگرچہ حقیقت میں ان کی کتابیں تحریف شدہ

ہیں۔ اس کے برعکس، اہل سنت اور شیعہ

اپنے بہت سے اعمال کو "بدعت" تسلیم کرتے

ہیں، اگرچہ وہ انہیں "بدعت حسنہ" کہہ کر

جائز قرار دیتے ہیں۔ اس مضمون میں اس

نکتے کا جائزہ لیا جائے گا کہ کیوں یہود و

نصاریٰ اہل کتاب کہلاتے ہیں، جبکہ اہل

سنت اور شیعہ اس میں شامل نہیں۔

یہود و نصاریٰ کو اہل کتاب کیوں کہا جاتا ہے؟

یہود و نصاریٰ کو اہل کتاب اس لیے کہا گیا کہ وہ اپنے گمان کے مطابق اللہ کی نازل کردہ کتابوں (تورات اور انجیل) کے مطابق عبادات انجام دیتے ہیں، اگرچہ حقیقت میں ان کتابوں میں تحریف ہو چکی ہے۔

اہل سنت و شیعہ کا معاملہ

اہل سنت اور شیعہ دونوں ہی بہت سی
عبادات کو "بدعت" مانتے ہیں، مگر ان میں
سے کچھ کو "بدعت حسنہ" (اچھی بدعت) قرار
دے کر جائز سمجھتے ہیں۔ مثال کے طور پر،
بریلوی مکتب فکر میں گیارہویں شریف، میلاد
النبی ﷺ، اور دیگر رسوم کو "بدعت حسنہ"
مانا جاتا ہے، جبکہ شیعہ مکاتب فکر میں بھی
کئی نئے اعمال موجود ہیں جنہیں سنت نہیں

کہا جا سکتا، مگر انہیں "اچھا عمل" قرار

دے کر قبول کیا جاتا ہے۔

ہر بدعت فی الدین گمراہی ہے۔ البتہ ہر

بدعت غیر دین گمراہی نہیں ہے ۔

نبی کریم ﷺ نے واضح طور پر فرمایا

ہے کہ:

"وَإِيَّاكُمْ وَمُحْدَثَاتِ الْأُمُورِ فَإِنَّ كُلَّ مُحْدَثَةٍ بِدْعَةٌ وَكُلَّ بِدْعَةٍ ضَلَالَةٌ . "

ترجمہ: نئی نئی بدعات و اختراعات سے اپنے آپ کو بچائے رکھنا ، بلاشبہ ہر نئی بات بدعت ہے اور ہر بدعت گمراہی ہے ۔

حوالہ: سنن ابي داود: 4607، جامع الترمذی: 2676، سنن النسائی: 1579)

نبی ﷺ نے خود فرمایا:

"کل بدعة ضلالة"

ترجمہ: ہر بدعت گمراہی ہے

حوالہ: صحیح مسلم: 867/2005

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

مَن أَحْدَثَ فِي أَمْرِنَا هَذَا مَا لَيْسَ مِنْهُ فَهُوَ رَدٌّ

ترجمہ: جس نے ہمارے اس دین میں کوئی

ایسی نئی چیز داخل کی جو اس میں سے

نہیں ہے، تو وہ مردود ہے۔

حوالہ: صحیح البخاری: 2697، صحیح مسلم:

1718/4492

(فِي أَمْرِنَا = فی الدین)

ایک اور روایت میں الفاظ یوں ہیں:

مَن عَمِلَ عَمَلًا لَيسَ عَلَيهِ أَمرُنا فَهُوَ رَدٌّ

ترجمہ: جس نے کوئی ایسا عمل کیا جس پر ہمارا حکم (طریقہ) نہیں تھا، تو وہ مردود ہے۔

حوالہ: صحیح مسلم: 1718/4493

یہ احادیث واضح طور پر بتاتی ہے کہ دین میں نیا اضافہ (بدعت) گمراہی ہے، اور اس میں "بدعت حسنہ" اور "بدعت سیئہ" کی کوئی تقسیم موجود نہیں۔

مکہ کے مشرکین اور بدعت کا تعلق

مکہ کے مشرکین بھی اپنے بنائے ہوئے طریقے سے عبادات کرتے تھے، اور وہ بغیر کسی

مستند دلیل کے اپنی عبادات کو دینِ ابراہیمی
سے منسوب کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ قرآن
میں ان کے بارے میں آیا ہے:

"وَإِذَا قِيلَ لَهُمُ ٱتَّبِعُوا۟ مَآ أَنزَلَ ٱللَّهُ قَالُوا۟ بَلْ
نَتَّبِعُ مَآ أَلْفَيْنَا عَلَيْهِ ءَابَآءَنَآ ۗ أَوَلَوْ كَانَ ءَابَآؤُهُمْ
لَا يَعْقِلُونَ شَيْـًٔا وَلَا يَهْتَدُونَ"

(سورة البقرة: 170)

ترجمہ: "اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ تم
اس کا اتباع کرو، جو اللہ نے نازل فرمایا

تو کہتے ہیں کہ بلکہ ہم اس کا اتباع کریں
گے جس پر ہم نے اپنے باپ دادوں کو پایا۔
کیا وہ اپنے باپ دادوں کا اتباع کریں گے
اگرچہ وہ کچھ بھی نہ سمجھتے ہوں اور
ہدایت پر نہ ہوں۔"

یہ آیت ظاہر کرتی ہے کہ مشرکین اپنے خود
ساختہ طریقوں کو عبادت سمجھ کر ان پر
کاربند تھے، اور اہل بدعت کا معاملہ بھی اسی
سے ملتا جلتا نظر آتا ہے۔

نتیجہ

یہود و نصاریٰ کو اہل کتاب اس لیے کہا جاتا ہے کہ وہ اپنے گمان میں آسمانی کتابوں کے مطابق عبادات کرتے ہیں، اگرچہ حقیقت میں ان کی کتابیں تحریف شدہ ہیں۔ اس کے برعکس، اہل سنت اور شیعہ بہت سے اعمال کو خود بدعت تسلیم کرتے ہیں، اگرچہ وہ انہیں "بدعت حسنہ" کا نام دے کر درست

سمجھتے ہیں۔ چونکہ وہ خود اپنی عبادات کو

بدعت مانتے ہیں، اس لیے انہیں اہل کتاب

میں شامل نہیں کیا جا سکتا، بلکہ وہ مکہ

کے مشرکین کی طرح ہیں، جو اپنے خود ساختہ

طریقے سے عبادات کرتے تھے۔

واللہ تعالیٰ اعلم

ضد و عناد

[میری ذاتی تحقیق ہے اگر میں خطا کر چکا ہوں تو یہ میری طرف سے ہے، اللّٰہ مجھے معاف کرے اور اگر میں حق تک پہنچا ہوں تو یہ خالص اللّٰہ کی طرف سے ہے]

ضد و عناد:

(میں اس پر پہلے بھی مضمون لکھ چکا ہوں وہ ملاحظہ فرمائیں)

ضد و عناد کی چند بنیادی وجوہات درجِ ذیل ہیں:

1. **تکبر**
2. **حسد**
3. **شخصیت پرستی**
4. **تعصب**

5. آباؤ اجداد کی اندھی تقلید

(یہ سب سے خطرناک ہے، کیونکہ یہ مزاج

میں رچ بس کر جذبات کی صورت اختیار کر

لیتا ہے اور مرتے دم تک انسان کا پیچھا

نہیں چھوڑتا۔ جب حق اس کے خلاف ہو تو

قبول کرنا مشکل ہو جاتا ہے، الا ما شاء

اللہ۔

اس میں رسم و رواج اور اکابرین بھی داخل

ہیں)

اپنی استطاعت کے مطابق ضد و عناد سے

پرہیز کرنا ایمان کا حصہ ہے۔

استطاعت کی قید اس لئے لگائی گئی کیونکہ

انسان اپنی استطاعت کے مطابق مکلف ہے۔

لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفۡسًا اِلَّا وُسۡعَهَا

ترجمہ: (البقرہ - 286)

اللہ نہیں مکلف بناتا کسی جان کو، جس کی

اسے طاقت نہ ہو،

اللہ غلطی سے پاک ہے، مخلوق خطا کرتی ہے:

شروع سے لے کر آج تک کوئی بھی تفسیر یا
شرح ایسی نہیں جو غلطی سے پاک ہو،
کیونکہ یہ مخلوق کی سمجھ پر مبنی ہوتی
ہیں۔ لیکن اصول یہ ہے کہ جو شخص اپنی
استطاعت کے مطابق ضد و عناد سے پرہیز
کرتا ہے اور اس کے باوجود غلطی کر بیٹھے،
تو وہ خطا اور غلطی معاف ہے، چاہے وہ غلطی
کتنی ہی بڑی کیوں نہ ہو۔

لیکن جو شخص ضد و عناد سے پرہیز نہیں کرتا، تو اگرچہ وہ بظاہر حق پر ہو، پھر بھی وہ منافقت پر ہے۔

اسی لیے کسی انفرادی شخص کو جہنمی کہنا نامناسب ہے، کیونکہ ضد و عناد باطنی معاملہ ہے۔ علمائے کرام جو کسی پر کفر یا گمراہی کا فتویٰ لگاتے ہیں، وہ شرعی احکامات نافذ کرنے کے لیے ہوتا ہے، نہ کہ کسی کے جنت یا جہنم کا فیصلہ کرنے کے لیے۔

حدیث کی روشنی میں

1. آپ ﷺ نے ایک باندی سے پوچھا :
" اللہ کہاں ہے ؟ " اس نے کہا : آسمان
میں ۔ آپ نے پوچھا : میں کون ہوں ؟
" اس نے کہا : آپ اللہ کے رسول ہیں ۔
تو آپ نے فرمایا :" اسے آزاد کر دو ، یہ
مومنہ ہے ۔"

حوالہ: صحیح مسلم - 537/1199

یہ روایت اس بات کی دلیل ہے کہ انسان

اپنی استطاعت کے مطابق مکلف ہے۔ اگرچہ

ظاہری طور پر کچھ معلومات کمزور لگیں،

لیکن اگر وہ ضد و عناد سے پرہیز کرتا ہو،

تو اللہ کے ہاں مسلمان شمار ہوگا، چاہے

ظاہری طور پر ایسا محسوس نہ ہو۔

2. یہود و نصاریٰ کے لیے نجات کی شرط:

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

"قسم ہے اُس ذات کی جس کے ہاتھ میں
محمد کی جان ہے! اس امت میں سے جو بھی
یہودی یا نصرانی میرا پیغام سنے اور پھر بھی
اس پر ایمان نہ لائے، وہ جہنم میں داخل
ہوگا۔"

حوالہ: صحیح مسلم: 153

اس حدیث میں واضح شرط رکھی گئی ہے کہ
جب تک کسی کو اسلام کی حقیقت نہیں

پہنچتی، وہ مکلف نہیں ہوتا۔ اگر حق اس

تک پہنچ چکا ہو، اور پھر بھی وہ قبول نہ

کرے، تو وہ جہنمی ہوگا۔ (ضد و عناد کی

بنا پر، نہ کہ کسی مخصوص معلومات کو نہ

سمجھنے کی وجہ سے۔ واللہ تعالیٰ اعلم)

نیز اپنی استطاعت کے مطابق علم و ہدایت

کی طلب لازم ہے ۔

خلاصہ:

تنہا بیٹھ کر ضد و عناد کی وجوہات پر غور کرے ضد و عناد ایک خطرناک چیز ہے جو رلا دینے والی بات ہے اور سارا مسئلہ بس یہی ہے ۔

عالم برزخ میں سوال و جواب کے وقت کافر یا منافق کا جواب یہ ہوتا ہے کہ مجھے معلوم نہیں ' میں نے لوگوں کو ایک بات کہتے سنا تھا وہی میں بھی کہتا رہا ۔ پھر اس سے کہا جاتا ہے کہ نہ تو نے خود سمجھا

اور نہ ہی تو نے (وحی کو) پڑھا۔ (صحیح بخاری - 1338)

اس پوسٹ کا فائدہ:

چونکہ ہر انسان اپنی استطاعت کے مطابق مکلف ہے کہ وہ ضد و عناد سے بچے، اس لیے انسان پر ایسی حقیقت جاننا لازم نہیں جیسی حقیقت اللہ پر واضح ہے ۔

ہر شخص اپنے اندر ضد و عناد کی موجودگی کا اندازہ تبھی لگا سکتا ہے جب وہ خود سے خلوص کے ساتھ سوال کرے اور تنہائی میں اپنا جائزہ لے۔

بہت سے لوگوں پر بقدرِ ضرورت حقیقت واضح ہو جاتی ہے، لیکن وہ اس انتظار میں رہتے ہیں کہ اللہ خود سامنے آکر حقیقت بتائیں، جیسا کہ بنی اسرائیل نے موسیٰ علیہ السلام سے مطالبہ کیا تھا:

وَإِذْ قُلْتُمْ يَا مُوسَىٰ لَن نُّؤْمِنَ لَكَ حَتَّىٰ نَرَى اللَّهَ جَهْرَةً فَأَخَذَتْكُمُ الصَّاعِقَةُ وَأَنتُمْ تَنظُرُونَ

"اور جب تم نے کہا: اے موسیٰ! ہم ہرگز تمہاری تصدیق نہ کریں گے جب تک کہ ہم اللہ کو علانیہ نہ دیکھ لیں، تو تمہیں بجلی نے پکڑ لیا، اور تم دیکھ رہے تھے۔" (البقرہ: 55)

اصل مسئلہ یہ ہے کہ ضد و عناد میں مبتلا

لوگ، اگر فرمائشی معجزات بھی دیکھ لیں،

تب بھی وہ حق کو قبول نہیں کریں گے۔

نوٹ: اس پوسٹ کے ساتھ یہ یاد رکھے ۔

رسول اللّٰہ ﷺ نے فرمایا:

طَلَبُ الْعِلْمِ فَرِيضَةٌ عَلَى كُلِّ مُسْلِمٍ (ابن ماجہ

– 224)

ترجمہ: علم (و ھدایت) کی طلب ہر مسلمان

پر فرض ہے ۔

واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

ایمانِ مجمل:

اٰمَنْتُ بِاللهِ کَمَا ھُوَ بِأَسْمَائِه وَ صِفَاتِه (معرفتِ

الٰہی)

وَقَبِلْتُ جَمِيْعَ اَحْكَامِه، اِقْرَارٌم بِاللِّسَانِ وَ تَصْدِيْقٌ م بِالْقَلْبِ. (احکاماتِ الٰہی)

ترجمہ:

"میں اللہ پر ایمان لایا، جیسے کہ وہ اپنے ناموں اور صفات کے ساتھ ہے، (معرفتِ الٰہی)

اور میں نے اس کے تمام احکام کو قبول کیا، زبان سے اقرار اور دل سے تصدیق کے ساتھ" (احکاماتِ الٰہی)

لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللہ (معرفتِ الٰہی کا پیمانہ)

مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللہ (احکاماتِ الٰہی - قرآن و حدیث)

ایمان مفصل:

حضرت جبرائیل علیہ السلام نبی کریم ﷺ کے پاس آئے اور پوچھا:

"أَخْبِرْنِي عَنِ الْإِيمَانِ؟"

"مجھے ایمان کے بارے میں بتائیے ۔"

آپ ﷺ نے فرمایا:

أَنْ تُؤْمِنَ بِاللَّهِ، وَمَلَائِكَتِهِ، وَكُتُبِهِ، وَرُسُلِهِ، وَالْيَوْمِ الْآخِرِ، وَتُؤْمِنَ بِالْقَدَرِ خَيْرِهِ وَشَرِّهِ

" یہ کہ تم اللہ تعالیٰ ، اس کے فرشتوں ، اس کی کتابوں ، اس کے رسولوں اور آخری دن (یوم قیامت) پر ایمان رکھو اور اچھی اور بری تقدیر پر بھی ایمان لاؤ ۔"

حوالہ: صحیح مسلم، حدیث: 8

واللہ تعالیٰ اعلم

فروعی اختلاف

فروعی اختلاف وہ ہوتا ہے جس میں دونوں

طرف مضبوط دلائل موجود ہوں۔

مثال کے طور پر:

سپیکر: "اُٹھو مت بیٹھو"

یہ جملہ دو مختلف معانی رکھتا ہے:

1. کھڑے ہونے کا حکم دیا گیا۔

2. بیٹھے رہنے کا حکم دیا گیا۔

یہاں اپنی خواہش کے مطابق مفہوم نکالنے کے بجائے سپیکر کی نیت معلوم کرنا ضروری ہے، جو سیاق و سباق اور دلائل کی بنیاد پر واضح ہوگی۔

دلائل کی نوعیت مختلف ہو سکتی ہے؛ بعض قوی ہوتے ہیں، بعض ناقص، اور بعض اوقات دونوں طرف وزنی دلائل ہوتے ہیں، جس سے اختلافی مسئلہ پیدا ہو جاتا ہے۔

مثلاً:

ایک شخص دلیل دیتا ہے کہ سپیکر بدتمیز ہے، لہٰذا پہلا مفہوم مراد ہے۔

دوسرا شخص دلیل دیتا ہے کہ سپیکر بدتمیز تو ہے، مگر جس سے مخاطب ہے وہ امیر آدمی ہے، اور وہ امیروں سے نرمی سے بات کرتا ہے، لہٰذا دوسرا مفہوم مراد ہے۔

یہی اصول فقہ میں بھی لاگو ہوتا ہے۔

فقہ

فقہ شریعت (قرآن و حدیث) کی انسانی فہم و تعبیر کو کہتے ہیں۔ فقہ بذاتِ خود شریعت نہیں، بلکہ شریعت کی تفہیم ہے، جس میں یہ کوشش کی جاتی ہے کہ اللہ کی مرضی اور نیت کو سمجھا جائے۔

فقہ شریعت کے مطابق بھی ہو سکتا ہے اور اس کے خلاف بھی، کیونکہ یہ انسانی اجتہاد پر مبنی ہوتا ہے۔

چنانچہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: 'جب کوئی حاکم اجتہاد کرے اور درست فیصلہ کرے تو اسے دو اجر ملتے ہیں، اور اگر وہ اجتہاد میں غلطی کرے تو اسے ایک اجر ملتا ہے۔' (صحیح بخاری: 7352، صحیح مسلم: 1716)

البتہ، خطا پر عمل نہیں کیا جائے گا،
بلکہ راجح دلیل کو اختیار کیا جائے گا۔

ائمہ اربعہ (امام ابو حنیفہ، امام مالک، امام
شافعی، اور امام احمد بن حنبل رحمہم اللہ)
کے درمیان فقہی مسائل میں اختلاف پایا جاتا
ہے۔ کسی فقہ کو دوسرے پر ترجیح دی جا
سکتی ہے، کیونکہ بعض آراء دلائل کے اعتبار
سے زیادہ قوی ہوتی ہیں۔

اللہ کی نیت معلوم کرنے کے لیے دلائل پیش کیے جاتے ہیں، جن کے بنیادی مصادر یہ ہیں:

1. قرآن و حدیث

2. صحابہ کرام کا اجماع اور تعلیمات (جو درحقیقت قرآن و حدیث ہی سے ماخوذ ہیں، جیساکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "آمِنُوا كَمَا آمَنَ النَّاسُ" [البقرة: 13]، یعنی ایمان لاؤ جیسے

لوگ ایمان لائے، اور یہاں "الناس" سے مراد

صحابہ کرام ہیں۔)

حدیث: بنو قریظہ میں عصر پڑھنے کا حکم

یہ حدیث صحیح بخاری (946) اور صحیح

مسلم (1770) میں موجود ہے۔

غزوۂ خندق کے بعد نبی کریم ﷺ نے صحابہ کو حکم دیا:

"لَا يُصَلِّيَنَّ أَحَدٌ الْعَصْرَ إِلَّا فِي بَنِي قُرَيْظَةَ"

ترجمہ:تم میں سے کوئی عصر کی نماز نہ پڑھے، مگر بنو قریظہ میں

راستے میں عصر کا وقت ہوگیا، تو صحابہ میں اختلاف ہوا:

1. بعض صحابہ نے کہا کہ نبی ﷺ کے الفاظ پر عمل کرتے ہوئے عصر کی نماز مؤخر کرنی چاہیے (تاکہ بنو قریظہ پہنچ کر پڑھی جائے)، چاہے قضا ہی کیوں نہ ہو۔

2. بعض نے کہا کہ مقصد جلدی پہنچنا تھا، نماز مؤخر کرنا نہیں، اس لیے انہوں نے راستے میں نماز پڑھ لی۔

جب یہ معاملہ نبی کریم ﷺ کے سامنے پیش ہوا تو آپ ﷺ نے کسی پر نکیر

نہیں فرمائی، یعنی دونوں اجتہادات کو درست تسلیم کیا۔

یہ حدیث اجتہاد اور شرعی متون کے فہم میں اختلاف کی گنجائش کے اصول کو واضح کرتی ہے۔

سلف صالحین کا طرزِ عمل

جب کسی فقہ کے دلائل قوی نظر آئیں، تو اسی کی طرف رجوع کرنا سلف صالحین کا طریقہ تھا، ضد و عناد ان کا شیوہ نہیں تھا۔

امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ اور ان کے دو جلیل القدر شاگرد امام ابو یوسف اور امام محمد رحمہم اللہ کے درمیان تقریباً 120 مسائل میں اختلاف تھا، مگر اس اختلاف کی

بنیاد پر نہ وہ لڑے اور نہ بغض رکھا،
کیونکہ وہ جانتے تھے کہ یہ دین کا حصہ ہے۔

یہی وجہ ہے کہ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ نے
بعض مواقع پر اپنے قول سے رجوع کر کے
شاگردوں کا قول اپنایا۔ ان میں تکبر نہیں
تھا کہ میں شاگرد کی رائے کو قبول کیوں
کروں!

اسی لیے، میرا تحقیقی نقطہ نظر یہ ہے کہ

صحابی کا قول و فعل میرے لیے تب تک

حجت ہے جب تک اس کی خطا کا علم نہ

ہو، اور غیر صحابی کا قول و فعل تب

حجت ہوگا جب معلوم ہو کہ وہ قرآن و

حدیث اور صحابہ کی تعلیمات کے موافق ہے۔

کیونکہ دین کی بنیاد وحی اور اس کے اولین

حاملین پر ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

'آمِنُوا كَمَا آمَنَ النَّاسُ' (البقرة: 13) یعنی

'ایمان لاؤ جیسے لوگوں نے ایمان لایا'، اور

یہاں 'الناس' سے مراد صحابہ کرام ہیں۔

نتیجہ

فروعی اختلاف وہی معتبر ہوتا ہے، جس میں

دونوں طرف مضبوط دلائل ہوں۔

فقہ شریعت کا متبادل نہیں، بلکہ شریعت کی انسانی فہم ہے، جو درست اور غلط دونوں ہو سکتی ہے۔

جب کسی فقہ کے دلائل قوی ثابت ہوں، تو اسی کو اختیار کرنا چاہیے، جیسا کہ سلف صالحین کا طرزِ عمل تھا۔

واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

منافقت سے ڈرنا ایمان کی علامت ہے

ابن ابي مليکہ نے کہا کہ میں نبی اکرم صلی
اللہ علیہ وسلم کے تیس صحابہ سے ملا، ان
میں سے ہر ایک کو اپنے اوپر نفاق کا ڈر
لگا ہوا تھا، ان میں کوئی یوں نہیں کہتا
تھا کہ میرا ایمان جبرائیل و میکائیل کے
ایمان جیسا ہے اور حسن بصری سے منقول
ہے، نفاق سے وہی ڈرتا ہے جو ایماندار ہوتا ہے
اور اس سے نڈر وہی ہوتا ہے جو منافق ہے۔

صحیح بخاری - 48

درجہ: معلق

واللہ تعالیٰ اعلم

اللہ کو محبوب بندہ: جو گناہوں کے بعد توبہ اور نیکی کرتا ہے

اسلام میں انسان کی فطری کمزوری کو نظرانداز نہیں کیا گیا۔ انسان سے گناہ سرزد

ہو جانا کوئی تعجب کی بات نہیں، مگر اصل خوبی اس میں ہے کہ وہ گناہ کے بعد نادم ہو، توبہ کرے اور نیکی سے اس کا ازالہ کرے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

> "إِنَّ اللهَ يُحِبُّ الْعَبْدَ الْمُؤْمِنَ الْمُفَتَّنَ التَّوَّابَ"

"بے شک اللہ اس مؤمن بندے سے محبت کرتا ہے جو (بار بار) گناہوں اور آزمائشوں میں مبتلا ہو کر (بار بار) توبہ کرنے والا ہو۔"

(مسند أحمد: 571)

یہ حدیث بتاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ اُن بندوں سے محبت کرتا ہے جو فتنوں یا گناہوں میں مبتلا ہو جائیں لیکن بار بار توبہ کرتے رہیں۔ اللہ کی نظر میں کامل وہ نہیں جو کبھی نہ گرے، بلکہ وہ ہے جو گرنے کے بعد پلٹ آئے۔

اسی مفہوم کو نبی کریم ﷺ نے ایک اور حدیث میں مزید واضح فرمایا:

> "اتَّقِ اللهَ حَيْثُمَا كُنتَ، وَأَتْبِعِ السَّيِّئَةَ الْحَسَنَةَ تَمْحُهَا، وَخَالِقِ النَّاسَ بِخُلُقٍ حَسَنٍ"

"اللہ سے ڈرتے رہو جہاں کہیں بھی ہو، اور برائی کے بعد نیکی کرو، وہ برائی کو مٹا دے گی، اور لوگوں سے حسنِ اخلاق کے ساتھ پیش آؤ۔"

(جامع الترمذی: 1987)

یہاں یہ بات قابلِ غور ہے کہ تقویٰ کا مطلب معصوم (یعنی گناہوں سے مکمل پاک)

ہونا نہیں، بلکہ مغفور ہونا ہے — یعنی ایسا
بندہ جو اگر گناہ کر بیٹھے تو اس کے بدلے
نیکی کرے جو گناہ کو مٹا دے، اور اس
نیکی (توبہ) کا بہترین ذریعہ حسنِ اخلاق ہے۔

قرآن کریم میں بھی اسی حقیقت کو بیان کیا
گیا ہے:

> "إِنَّ الْحَسَنَاتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّئَاتِ"
"یقیناً نیکیاں برائیوں کو مٹا دیتی ہیں۔"

یا

بے شک نیکی برائی کے برے اثرات کو مٹا دیتی ہے

(سورہ ہود: 114)

اور ان لوگوں کی مدح کی گئی ہے جو گناہ کے بعد اللہ کو یاد کرتے اور توبہ کرتے ہیں:

< "وَاللَّهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ ۞ وَالَّذِينَ إِذَا فَعَلُوا فَاحِشَةً أَوْ ظَلَمُوا أَنْفُسَهُمْ ذَكَرُوا اللَّهَ، فَاسْتَغْفَرُوا

لِذُنُوبِهِمْ، وَمَنْ يَغْفِرُ الذُّنُوبَ إِلَّا اللَّهُ، وَلَمْ يُصِرُّوا عَلَىٰ مَا فَعَلُوا وَهُمْ يَعْلَمُونَ"

"اللّٰہ محسنین سے محبت کرتا ہے اور (محسنین) وہ لوگ کہ جب کوئی بے حیائی کریں یا اپنے اوپر ظلم کریں تو فوراً اللّٰہ کو یاد کرتے ہیں، پھر اپنے گناہوں کی بخشش مانگتے ہیں — اور اللّٰہ کے سوا کون ہے جو گناہ بخشے؟ — اور وہ جانتے بوجھتے گناہ پر اصرار نہیں کرتے۔ (کہ صرف گناہ ہی کرتا

رہے، بدلے میں نیکی نہ کرے۔ بلکہ گناہ کے

بدلے نیکی کرتا رہتا ہے)۔"

(سورہ آل عمران: 134–135)

یہ تمام نصوص ہمیں یہ سبق دیتی ہیں کہ

مومن کا اصل کمال گناہ سے پاک ہونا نہیں،

بلکہ گناہ کے بعد توبہ، ذکر، نیکی، اور حسنِ

اخلاق ہے — یہی وہ صفات ہیں جو اللہ

تعالیٰ کو محبوب ہیں۔

واللہ تعالیٰ اعلم

اس کے بعد میری ادھوری تحقیقی مضامین ہیں

جن کا مقصد یہ ہے کہ تمہیں بھی اس کے بارے اندازہ ہو جائے کہ اس کی تحقیق ضروری ہے۔

ایمان اور ضروریاتِ دین:

اہلِ علم نے ضروریاتِ دین کی تعریف اس
طرح کی ہے کہ وہ علم جو محلے کے دین دار
شخص کو بغیر کسی نظر و اجتہاد کے حاصل
ہو جائے، وہ ضروریاتِ دین کہلاتا ہے اور اس
پر ایمان لانا ضروری ہے۔ مثلاً، اگر محلے کے
دین دار شخص کو بغیر کسی غور و فکر کے
مسواک کے بارے میں علم ہو کہ یہ دین
کا حصہ ہے، تو مسواک کو دین کا حصہ

سمجھنا ایمان کا حصہ ہے۔ اگر کوئی شخص یہ کہے کہ مجھے نہیں معلوم کہ مسواک دین کا حصہ ہے یا نہیں، تو اس پر کفر کا الزام عائد کیا جائے گا۔

اس کا فائدہ یہ ہے کہ انسان ہمیشہ حق کے طالب رہتا ہے۔

لیکن اس کا نقصان یہ ہے کہ انسان شک و شبہ میں رہ سکتا ہے کیونکہ دین دار شخص ایک خارجی معاملہ ہے اور دینداری کی حد کا

پتہ نہیں چلتا۔ پھر محلے میں دین دار شخص

کو متعین کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ اگر پھر

اس سے پوچھا جائے کہ تمہیں بغیر نظر کے

کتنا علم حاصل ہے، تو وہ خود بھی نہیں بتا

پائے گا۔ اور اگر بتا دیا تو ایک پوری

ڈکشنری بن جائے گی، جسے یاد کرنا مشکل

ہے، اور انسان بھول بھی جاتا ہے، پھر بھی

تعریف کے مطابق وہ کافر شمار ہوگا۔

اس لیے میں نے ضروریات دین کے مقابلے
میں ضد و عناد کی اصطلاح قرآن و حدیث
سے ماخوذ کی ہے، جس پر میں نے پہلے ہی
دو مضامین لکھے ہیں۔

ضد و عناد اپنے ہی باطن کا معاملہ ہے اور
انسان خود سے سوال کر کے اس کا علم
حاصل کر سکتا ہے۔

البتہ اس کا بھی نقصان یہ ہے کہ ایمان کے
دائرے اور حد کا پتہ نہیں چلتا۔

اس کا ازالہ یہ کیا ہے کہ میں نے حدیث جبریل میں ایمان مفصل پر ایمان لانے کی بات کی ہے۔ اور "لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللہ" کے لوازمات پر ایک مضمون بھی بنا چکا ہوں، جسے پڑھا جا سکتا ہے۔

پھر بھی، بہتر یہ ہے کہ اہل علم سے پوچھا جائے کیونکہ میں خود ایمان کی تحقیق میں ہوں اور اس کا دائرہ معلوم کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔

والله تعالیٰ اعلم

لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللہ کے لوازمات:

لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللہ کا اظہار انبیاء علیہم السلام پر فرشتوں کے ذریعے کتابوں میں نازل ہوا، جس سے رسولوں، کتابوں اور فرشتوں پر ایمان لانا لازم ہوا۔

لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللہ توحید فی الذات، توحید فی الصفات اور توحید فی الافعال کا نتیجہ ہے۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اللہ کی ذات، صفات اور افعال میں کسی کا شریک نہیں ہے اور ان پر ایمان لانا ضروری ہے۔

اللہ کی صفات میں رب بھی شامل ہے، جس کا مطلب ہے کہ اللہ وہ ہے جو انسانوں کی تربیت کرتا ہے۔ جو شخص اللہ کی تربیت حاصل کرتا ہے، وہ اعلیٰ مقام پر پہنچتا ہے،

اور یہی مقام جنت ہے۔ اور جو اس تربیت

سے محروم رہتا ہے، اس کا نتیجہ جہنم ہے۔

اللّٰہ کی صفات میں رحمت اور شکور ہے جس

سے نیکی کا بدلہ لازوال ملتا ہے جس کا

نتیجہ جنت ہے ۔

اللہ کی صفات میں علم، قدرت اور حکمت

بھی شامل ہیں، جن سے تقدیر پر ایمان لانا

لازم آتا ہے۔ تقدیر اللہ کے علم، قدرت اور

حکمت سے مرتب ہوتی ہے اور اس پر ایمان

لانا ضروری ہے۔

"اِلٰہَ" معبود کو کہتے ہیں اور عبادت کے

مستحق کو معبود کہا جاتا ہے ۔ میں نے

عبادت کی لغوی اور اصطلاحی تعریف پر

مضمون لکھیں ہیں ۔

عبادت کی تمام ممکنہ اقسام پر بھی اور قرآن

و حدیث سے عبادت کی دو اقسام پر بھی

مضمون لکھ چکا ہوں۔

لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللہ کے لوازمات وجہ ہو سکتی ہے

کہ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللہ پر جنت کی خوشخبری ہے

کیونکہ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللہ میں دلیل کی اہمیت

پر بھی زور دیا گیا ہے یعنی کتاب اللہ پر

ایمان لانا۔ واللہ تعالیٰ اعلم

دلیل پر بھی میں مضمون بنا چکا ہوں ۔

مشکوٰۃ شریف – 37

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«مَنْ مَاتَ وَهُوَ يَعْلَمُ أَنَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ دَخَلَ الْجَنَّةَ» . رَوَاهُ مُسلم

جس شخص کو اس حالت میں موت آئے کہ وہ جانتا ہو کہ اللہ کے سوا کوئی معبود برحق نہیں تو وہ جنت میں داخل ہو گا۔

رواہ مسلم و الترمذی (۱/ ۶۵، ۳۹۴، ابن حبان (۲۰۱)۔

واللہ تعالیٰ اعلم۔

قرآن و حدیث اور انسانی فہم کی حدود

مقدمہ

اللہ تعالیٰ نے انسان کو ہدایت و تربیت کے لئے عظیم سرچشمہ عطا فرمایا: قرآن و حدیث۔

قرآن وہ وحی ہے جو لفظاً اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوئی۔

حدیث میں دو پہلو ہیں:

1. وحی پر مبنی احادیث جو نبی کریم ﷺ پر نازل کی گئیں۔

2. اسی نازل کردہ قرآن و حدیث میں فقہ و اجتہادِ محمدی ﷺ جو قرآن میں مذکور "حکمت" کے تحت آتا ہے۔ اس فقہ محمدی ﷺ کو بھی حدیث کہا جاتا ہے ۔

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ

(سورة الجمعة: 2)

یعنی نبی ﷺ لوگوں کو کتاب (قرآن و حدیث) اور حکمت (حدیث وفقہ نبوی ﷺ) سکھاتے ہیں۔

فہمِ وحی کی حد

قرآن و حدیث کے الفاظ تو انسان یاد کر سکتا ہے، مگر ان کے مفاہیم و اسرار کا

مکمل احاطہ کوئی نہیں کر سکتا—— یہاں

تک کہ نبی کریم ﷺ بھی نہیں۔ بلکہ اللہ

تعالیٰ جتنا نبوت، تربیت اور ہدایت کے لئے

ضروری سمجھاتا ہے، اتنا ہی نبی کو بتاتا ہے،

اور وہ بھی ایک ساتھ نہیں بلکہ وقتاً فوقتاً۔

علت: لِنُثَبِّتَ بِهٖ فُؤَادَكَ وَرَتَّلْنٰهُ تَرْتِيْلًا ۝

الفرقان 32

تَنْزِيْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ واقعہ 80

اسی طرح انسان کی عملی تربیت کے لئے اللہ تعالیٰ کبھی قرآن و حدیث کی بعض آیات و احادیث کو اس کے ذہن سے بھلا دیتا ہے۔

مثلاً:

اگر کوئی شخص ناامیدی میں ہو تو وعید والی آیات بھلا دی جاتی ہیں تاکہ مایوسی نہ ہو۔

اور اگر کوئی شخص گناہ کرکے بے فکر ہو جائے تو اس کے ذہن سے رحمت والی آیات

اور احادیث ہٹا دی جاتی ہیں تاکہ ڈر اور احتیاط پیدا ہو۔

مثالیں

1. سائنس کے حقائق

قرآن و حدیث میں کئی سائنسی اشارات ملتے ہیں، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ نبی

کریم ﷺ کو ان کے تمام سائنسی باریک پہلو معلوم تھے۔ وہ صرف اتنا جانتے تھے جتنا ہدایت اور نبوت کے مقصد کے لئے ضروری تھا۔

---

2. زمینداری کا معاملہ

قرآن و حدیث میں زمینداری کے متعلق

اشارات موجود ہیں، مگر نبی کریم ﷺ نے

خود فرمایا:

"أَنْتُمْ أَعْلَمُ بِأُمُورِ دُنْيَاكُمْ"

"تم اپنے دنیاوی معاملات کو بہتر جانتے ہو۔"

(صحیح مسلم، حدیث: 2363)

یہ بتاتا ہے کہ دنیاوی علوم جیسے زمینداری یا

سائنس، نبی ﷺ کی بعثت کا مقصد نہیں

تھے۔ ان کا اصل مقصد ہدایت اور تربیت تھا۔

---

3. عذابِ قبر کا علم

قرآن میں عذابِ قبر کا ذکر ہے:

يُثَبِّتُ اللّٰهُ الَّذِينَ آمَنُوا... وَيُضِلُّ اللّٰهُ الظّٰالِمِينَ

(سورۃ ابراہیم: 27)

مگر تاریخی طور پر دیکھا جائے تو مدنی دور

تک نہ ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو اور

نہ ہی نبی کریم ﷺ کو اس کا علم تھا۔

صحیح مسلم میں روایت ہے کہ ایک یہودی

عورت نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو عذابِ قبر کا

بتایا۔ جب آپ رضی اللہ عنہا نے نبی کریم ﷺ سے

پوچھا تو وحی کے ذریعے اس کی تصدیق ہوئی،

اور اس کے بعد نبی کریم ﷺ نے باقاعدہ

عذابِ قبر سے پناہ مانگنا شروع کیا۔

(صحیح مسلم، حدیث: 584)

یہ واقعہ اس بات کی دلیل ہے کہ نبی ﷺ کو بھی وقتاً فوقتاً وہی علم دیا جاتا تھا جو ہدایت اور تربیت کے لئے ضروری ہوتا۔ اسی سے "ضروریات دین" کی اصطلاح پر بھی نظرثانی کی ضرورت واضح ہوتی ہے۔

نتیجہ

ان مثالوں سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ
قرآن و حدیث کے الفاظ تو انسان محفوظ کر
سکتا ہے، لیکن ان کے معانی و اسرار پر
مکمل احاطہ کسی کے لئے ممکن نہیں۔ انبیاء
علیہم السلام کو بھی صرف اتنا ہی علم عطا
کیا جاتا ہے جتنا ان کی نبوت، ہدایت اور
تربیت کے لئے ضروری ہو۔

اور آخر میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہی اصل
اصول ہے

وَمَا أُوتِيتُم مِّنَ الْعِلْمِ إِلَّا قَلِيلًا

(سورة بنی اسرائیل: 85)

"تمہیں علم میں سے بہت ہی تھوڑا دیا گیا ہے۔"

قرآن و حدیث کی تفسیر کا حق کسی ایک نے مکمل طور پر ادا نہیں کیا، یعنی کسی نے بھی پورا فہم نہیں بتلایا۔ اس لئے ضروری ہے کہ ہم مختلف تفاسیر میں غور و فکر کریں، نہ کہ صرف ایک پر اکتفا کریں،

ورنہ ہماری حالت کنویں کے مینڈک کی سی ہوگی۔

واللہ اعلم

—

کیا قادیانیوں پر فتویٰ دینے والوں کا معیار یکساں ہے؟

جو شخص پورے ہوش و حواس میں نبوت کا

دعویٰ کرے، وہ بلا شک و شبہ کافر ہے۔

لیکن

جو شخص قرآن و حدیث میں بے جا تاویل

کرکے یہ نظریہ پیش کرے کہ نبوت جاری ہے

اور ایک اور نبی آئے گا، تو اس پر وہی

حکم لاگو ہوگا جو اہلِ سنت (بریلوی) اور

شیعہ کے بارے میں دیا گیا ہے۔

بلکہ

اگر غور کیا جائے تو اہلِ سنت (بریلوی) اور شیعہ، قادیانیوں سے بھی زیادہ گمراہ ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ قادیانی رسالت میں گمراہ ہوئے، جبکہ اہلِ سنت (بریلوی) اور شیعہ توحید میں گمراہی کا شکار ہو چکے ہیں۔ مزید برآں، ختمِ نبوت کا ثبوت صرف نقل (قرآن و حدیث) سے ملتا ہے، جبکہ توحید کا

اثبات عقل و نقل دونوں سے ہوتا ہے، اس

لیے توحید میں گمراہی زیادہ سنگین ہے۔

(کیا ختمِ نبوت پر یقین، توحید جتنا مضبوط

ہے؟)

بلکہ پشتو میں کہا جاتا ہے: "زڑہ پہ اوبہ

سخی" (مضبوط یقین) یعنی توحید بالکل واضح

اور بدیہی حقیقت ہے۔ پورا قرآن و حدیث

اسی توحید کی تعلیم کے لیے آیا ہے، اور

رسالت کا مقصد ہی درحقیقت توحید کا قیام

ہے۔

میرے نزدیک قادیانیوں پر کفر کا فتویٰ

بریلویوں نے نبی کریم ﷺ کی محبت میں

حد سے تجاوز کرتے ہوئے لگایا ہے۔

بریلویوں کے علاوہ جن دیگر علماء نے

قادیانیوں پر کفر کا فتویٰ دیا ہے، اگر انہوں

نے اہلِ سنت (بریلوی) اور شیعوں پر بھی

یہی فتویٰ نہیں لگایا، تو یہ دوہرا معیار اور

خواہش پرستی پر مبنی فتویٰ ہوگا۔

نوٹ: واضح رہے کہ میں ذاتی طور پر اہلِ

سنت (بریلوی) اور شیعوں کو قادیانیوں سے

زیادہ گمراہ سمجھتا ہوں، لیکن چونکہ میں

مفتی نہیں ہوں، اس لیے میرے فتوے کی

کوئی حیثیت نہیں۔ مذکورہ بالا مضمون میں

میں نے کسی پر فتویٰ نہیں لگایا بلکہ ان

علماء کے فتوے پر نظرِ ثانی کی ضرورت پر
بات کی ہے جنہوں نے یہ فتوے دیے ہیں۔

واللہ تعالیٰ أعلم۔

شریعت محمدی ﷺ پر ایمان کی خصوصیت:

(میری ذاتی تحقیق ہے اگر میں خطا کر چکا
ہوں تو یہ میرے اور شیطان کی طرف سے
ہیں ۔ اللہ مجھے بخش دے۔ اور اگر میں

حق تک پہنچا ہوں تو یہ خالص اللہ کی

طرف سے ہیں)

امام ابو حنیفہ رحمہ اللّٰہ علیہ فرماتے ہیں کہ

ایمان تصدیق قلب کا نام ہے ۔

امام شافعی رحمہ اللّٰہ علیہ فرماتے ہیں کہ

ایمان تصدیق قلب ، اقرار بالسان اور اعمال

کا مرکب ہے ۔

دونوں تعریف میں کوئی تعارض نہیں ہے ۔

شریعت محمدی پر ایمان لانے کی خاصیت یہ

ہے کہ یہ مومن کو اعمال کی طرف متوجہ

کرتا ہے ۔

اس کی مثال ایک ایسے درخت کی ہے جو

میوہ پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے ۔ یہ

درخت ایمان ہے اور درخت کا میوہ اعمال

صالحہ ہیں ۔

امام ابو حنیفہ رحمہ اللّٰہ نیچے سے بیان کرتا

ہے اور امام شافعی اوپر سے بیان کرتا ہے ۔

تصدیق قلب سے بندہ مومن بن جاتا ہے پھر

عین اسی وقت مر گیا تو مومن ہے اگر اس

کو زندگی مل گئی تو شریعت محمدی پر

ایمان لانے کی خصوصیت یہ ہے کہ عمل

کرنے کے لئے بھی متوجہ کرتا ہے لہذا ثمرہ

کے طور پر اعمال صالحہ بھی کرے گا اگر

نہیں کرتا تو منافق ہے یعنی سرے سے ایمان

ہی نہیں لایا ہے۔ مختصر یہ کہ اس امت کا

مومن توابین ہوتا ہے ۔

اب اسی بات کو امام شافعی رحمہ اللّٰہ علیہ

نے دوسرے سرے سے بیان کی ہے کہ اگر

ثمرہ یعنی اعمال صالحہ نہیں ہے تو اس کا

مطلب یہ ہے کہ ایمان ہی نہیں ہے ۔ ایمان

ہوتا تو اللہ اس سے نیک اعمال بطور ثمرہ

کرواتا ۔جیسا کہ قرآن میں ارشاد ہے

وَمَنْ يُّؤْمِنْ بِاللّٰهِ يَهْدِ قَلْبَهٗ

ترجمہ: (التغابن - 11)

اور جو بھی کوئی شخص اللہ پر ایمان لائے

وہ اس کے قلب کو ہدایت دے دیتا ہے۔

لہذا دونوں اقوال صحیح ہے کبھی امام ابو

حنیفہ کے قول کی ضرورت ہوتی ہے اور کبھی

امام شافعی کے قول کی۔

ایمان لانے کے لئے امام ابوحنیفہ رحمہ اللّٰہ

علیہ کے قول کی ضرورت ہے اور اپنی ایمان

کو معلوم کرنے کے لئے یعنی منافقت سے بچنے

کے لئے امام شافعی رحمہ اللّٰہ علیہ کے قول

کی ضرورت ہے ۔

اس کے برعکس مرجیہ کا قول ہے وہ کہتے

ہیں کہ ایمان کے لئے نیک عمل کی ضرورت

نہیں ہے ۔ یہ قول امام ابو حنیفہ رحمہ اللّٰہ

علیہ کے قول کے مطابق ہے لیکن فرق صرف

یہ ہے امام ابوحنیفہ رحمہ اللّٰہ کے کہنے کا

مطلب یہ ہے کہ ایمان دار بننے کے لئے

تصدیق قلب کافی ہے باقی اس ایمان میں اتنی

صلاحیت ہے کہ یہ نیک عمل کی طرف متوجہ

کرتا ہے اور بندہ کو توابین بناتا ہے جبکہ

مرجیہ ایمان میں اس صلاحیت کے قائل نہیں

ہے کہ اگر ساری عمر وقت ملنے کے باوجود

ایک نیکی بھی نہ کرے تب بھی یہ ایمان

موجود رہتا ہے جبکہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللّٰہ

علیہ کہتا ہے کہ تصدیق قلب سے مومن کو

اگر نیکی کا موقع میسر نہ ہو جائے یعنی

فوراً مر جائے تو مومن ہے۔ جیسا کہ ایک

صحابی اپنی سواری پر ایمان لائے اور واپس

جاتے ہوئے اپنی سواری سے گر کر فوت ہوئے

تو نبی کریم ﷺ نے جنت کی خوشخبری

سنا دی انہیں نیکی کا موقع ہی نہیں ملا۔

مرجیہ کا قول پچھلی شریعتوں میں ممکن

تھا کیونکہ پچھلی شریعتوں میں ایسے مومن

گزر چکے ہیں جنہوں نے ساری عمر نیکی

نہیں کی ہے باوجود وقت ملے۔

اس امت کے ایمان کی خاصیت یہ ہے کہ

بندہ توابین ہوتا ہے ۔ (پہلے میں نے تقریباً

11 گناہ کبیرہ لکھے ہیں، ان کے علاوہ اور

بھی ہوں گے جو مجھے یاد نہیں) اس امت کا

مومن ان گناہوں کو مستقل طور پر نہیں

کرتا ۔ اسی طرز زندگی سے یعنی توابین بنتے

ہوئے جو کبیرہ گناہ رہ جائے تو شفاعت

کبریٰ سے معاف کیا جائے گا۔ جن کا نام

جہنم میں لکھا ہو انہیں داخل ہونے سے پہلے

ہی معاف کیا جائے گا ۔

جو شخص ان گناہوں کو مستقل طور پر کرتا

ہے وہ منافق ہوتا ہے یعنی سرے سے مومن ہی

نہیں ہوتا۔

یہی وجوہات ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے

فرمایا کہ (مفہوم) میری امت پر اللّٰہ نے

خصوصی رحم کیا ہے اس امت کے مومن پر

آخرت میں عذاب نہیں ہے ۔ گناہوں کی سزا

دنیا میں مختلف قسم کے تکالیف کے ذریعے

ملتی ہے ۔

اس وجہ سے مومن اپنے گناہوں کی (سزا کا)

اثر مٹانے کے لئے بار بار رجوع کرتا ہے اور

نیکیاں کرتا رہتا ہے جو مومن کو توابین بناتا

ہے ۔

مومن اپنے بارے میں منافقت سے ڈرتا ہے اور

اللہ کی نظروں میں مومن بننے کی کوشش کرتا

رہتا ہے یہاں تک کہ موت آ جائے ۔

(مقصد یہ کہ اس پوسٹ کو پڑھ کر گناہوں

پر نڈر نہ ہو جانا۔ خوب سوچ لے اس پوسٹ

کا مطلب گناہوں پر نڈر ہو جانا نہیں ہے

بلکہ اپنے ایمان کے بارے میں فکرمند ہونا

ہے کہ میرے ایمان کا ثمرہ نہیں ہے تو کیوں

نہیں ہے کیا میں منافق ہوں۔ یوں اللّٰہ سے

حقیقی ایمان طلب کرتے رہئے)

اس پوسٹ کا فائدہ:

ان احادیث کا مطلب واضح ہوگیا جن میں صرف ایمان پر جنت کی خوشخبری سنائی گئی ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«مَنْ مَاتَ وَهُوَ يَعْلَمُ أَنَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ دَخَلَ الْجَنَّةَ» . رَوَاهُ مُسلم

ترجمہ: "جس شخص کو اس حالت میں موت آئے کہ وہ جانتا ہو کہ اللہ کے سوا کوئی

معبود برحق نہیں تو وہ جنت میں داخل ہو

گا۔"

اس حدیث میں صرف معرفت الٰہی پر جنت

کی خوشخبری سنائی ہے۔

اصل میں قرآن و حدیث کے ذریعے معرفت

الٰہی حاصل کرنے والا مومن اللّٰہ کی طرف ہی

دوڑے گا اور توابین بنے گا۔ انسان اپنی خیر

و بھلائی کے بارے میں حریص ہے اور مومن

کو یقین ہو چکا ہوتا ہے کہ میری خیر و

بھلائی اللہ کے پاس ہے اس لئے اپنی فطرت

سے مجبور ہو کر اللہ کی طرف دوڑے گا۔

پھر اللہ ان سے نیک اعمال کرواتا رہے گا ۔

اور اللہ سے محبت میں بھی نیک عمل کرتا

رہے گا ۔

اگر وہ کبیرہ گناہ (جو پہلے میں ذکر کر چکا

ہوں اور ممکن ہے مزید بھی ہو) مستقل طور

پر کوئی کرتا ہے تو اس کا یہ مطلب ہو

سکتا ہے کہ اس کی معرفت الٰہی میں

کوتاہی/شرک ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم

نکتہ:

لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللہ سیکھنے اور سیکھانے میں خوب محنت کرو ۔۔ اعمال صالحہ کی فضا (اللّٰہ کے فضل و رحم سے) اپنا آپ پیدا ہو جائے گی ۔

(نوٹ: ایمان کی تفصیل میں اور بھی بہت کچھ ہیں جس کو اللہ ہی بہتر جانتا ہے، میں فی الحال تحقیق میں ہوں)

واللہ تعالیٰ اعلم

کبیرہ گناہ جو کفر و منافقت پر خاتمے کا سبب بن سکتا ہے

۔

(میری تحقیق کے مطابق) بعض گناہ بذاتِ
خود کفر نہیں ہوتے لیکن مستقل طور پر
ارتکاب کرنے سے کفر پر خاتمے کا خطرہ ہوتا
ہے۔

چند مندرجہ ذیل ہیں:

1) قصداً اور جان بوجھ کر قتلِ ناحق ۔

(سورۃ النساء – 93)

2) ناجائز طریقے سے یتیم کا حق مارنا ۔

(سورۃ الماعون – 2)

3) قصداً بلا عذر فرض نماز ترک کرنا۔ (یا

ہدایت کی دعا نہ مانگنا۔ نماز ہدایت کی دعا

پر مشتمل ہے۔) (سورۃ المدثر – 43)

4) مسکین کو نہ کھلانا اور مسکین کے

طعام کی ترغیب نہ دینا۔ (سورۃ المدثر – 44

۔۔ اور سورۃ الماعون – 3)

5) لواطت۔ مردِ کا مردِ سے شہوت پورا کرنا۔

(قومِ لوط کے واقعے سے ماخوذ)

6) ناپ تول میں کمی کرنا ۔ (قومِ شعیب

کے واقعے سے ماخوذ)

7) مستقل شرابی ۔ (حوالہ: مسند احمد –

18752 –۔ مسند احمد –2325)

8) قطع رحمی کرنا – (صحیح بخاری –

5984 اور صحیح مسلم – 6520)

9) اس نیت سے گناہ کرنا کہ چند دن جہنم

میں رہیں گے پھر ویسے بھی نکل جائیں گے

۔ (یہودیت)

10) شفاعت کی امید پر گناہ کرنا کہ محمد ﷺ ، عیسیٰ علیہ السلام ، علی رضی اللہ عنہ ، وغیرہ ہمیں بخشوائیں گے یا اس امید پر گناہ کرنا کہ ہم اللّٰہ کے لاڈلے اور محبوب ہیں لہذٰا گناہ کرتے رہو کچھ نہیں کہیں گے۔ (عیسائیت)

11) مستقل قصداً جھوٹ بولنا/ حدود میں جھوٹی گواہی دینا ۔ متفق علیہ ۔ صحیح بخاری – 6094

صحیح مسلم – 6637

واضح رہے کہ یہ گناہ تب کفر پر خاتمے کا
سبب بن سکتے ہیں جب ان میں سے ایک
یا کئی گناہ مستقل طور پر کیا جائے ۔
مثلاً
شراب پیتا رہا اور بے فکر ہوتا رہا تو یہ
مستقل شرابی ہے جس پر جہنم کی وعید ہے
۔

اگر شراب پی کر اس گناہ کے بدلے خوب

نیکیاں کرتا رہتا ہے تاکہ اس گناہ کا اثر

مٹ جائے تو یہ مستقل شرابی نہیں کہلاتا ہے

اور مذکورہ وعید سے بچ جائے گا ۔

لیکن مذکورہ گناہوں کا ازالہ کیسے کیا جائے

یہ بھی ایک سوالیہ نشان ہے اس لئے سرے

سے ہی توبہ کرے۔

9 اور 10 نمبر گناہ کے برعکس مومن توبہ

کی امید پر گناہ کرتا ہے اور لمبی امید سے

پرہیز کرتا ہے کہ صبح کے گناہ شام تک

مٹانے کی کوشش کرتا ہے اور شام کے صبح

تک ۔ اور تقدیر میں مومن لکھے جانے

(یعنی خاتمہ ایمان پر ہونے) کے لئے اپنی

استطاعت کے مطابق محنت کرتا ہے اسی کو

مقصد بناتا ہے اور باقی اعمال اسی کے لئے

کرتا ہے تاکہ اللہ مل جائے اور اللہ کی شان

کے مطابق لازوال اجر مل جائے، لازوال اجر

کا لازم نتیجہ جنت ہے یعنی جنت مل جائے

۔

راز:

مذکورہ بالا گناہوں کو مستقل طور پر کرنے

والا منافق ہوتا ہے ۔ واللہ تعالیٰ اعلم

مسئلہ:

یہ اس امت کے ایمان کی خاصیت ہے کہ

اس امت کا مومن توابین ہوتا ہے اور مذکورہ

بالا گناہ مستقل طور پر نہیں کرتا ہے اور

دیگر گناہوں کی سزا اس دنیا میں دی جاتی

ہے اس لئے حدیث کے مطابق اس امت کے

مومن کو آخرت میں عذاب نہیں دیا جائے گا

۔

ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میری اس امت پر اللہ کی رحمت ہے آخرت میں اسے عذاب نہیں ہوگا اور دنیا میں اس کا عذاب: فتنوں، زلزلوں اور قتل کی شکل میں ہوگا ۔

حوالہ: سنن ابو داؤد – 4278

"اور وہ لوگ کہ جب کوئی بے حیائی کر

بیٹھتے ہیں یا اپنی جانوں پر ظلم کر لیتے

ہیں تو اللہ کو یاد کرتے ہیں اور اپنے گناہوں

کی معافی مانگتے ہیں — اور اللہ کے سوا کون

گناہوں کو بخش سکتا ہے؟ — اور وہ جان

بوجھ کر اپنے کیے پر اصرار نہیں کرتے۔"

آل عمران - 135

واللہ تعالیٰ اعلم

—

شراب کے بارے میں قرآن و حدیث کی روشنی میں

انسان اپنی فطرت کے اعتبار سے خیر و
بھلائی کا حریص ہے۔ یہی فطرت انسان کو
اللہ کی طرف مائل کرتی ہے، اسے حق کا
متلاشی بناتی ہے اور وہ ہمیشہ ہدایت کی دعا
کرتا رہتا ہے۔ لیکن شراب نوشی اس فطری
طلب کو مٹا دیتی ہے۔ جب تک نشہ باقی
رہتا ہے، انسان حق و باطل کی پرواہ نہیں

کرتا۔ اگرچہ حق اس کے سامنے واضح ہو، لیکن وہ اس سے بے اعتنا رہتا ہے اور ہدایت کی طلب و دعا کو ترک کر دیتا ہے۔

اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

> يَسْأَلُونَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ ۖ قُلْ فِيهِمَا إِثْمٌ كَبِيرٌ وَمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَإِثْمُهُمَا أَكْبَرُ مِن نَّفْعِهِمَا ۗ (البقرہ 219)

كَذَٰلِكَ يُبَيِّنُ اللَّهُ لَكُمُ الْآيَاتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُونَ

فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ

(219–220 البقرہ)

لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُونَ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ

شراب نوشی سے اجتناب کی حکمت یہ ہے کہ

انسان اپنی اصل فطرت کی طرف متوجہ ہو،

دنیا کی فنا اور آخرت کی بقا پر غور کرے،

اور ہدایت کی طلب و دعا کو مسلسل زندہ

رکھے۔

شراب اور ذکر و صلاۃ سے غفلت

سورہ مائدہ میں فرمایا گیا:

> **إِنَّمَا يُرِيدُ الشَّيْطَانُ أَنْ يُوقِعَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَاءَ فِي الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ وَيَصُدَّكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللَّهِ وَعَنِ الصَّلَاةِ فَهَلْ أَنْتُمْ مُنْتَهُونَ**

(المائدہ: 91)

یہاں "ذکر" اور "صلاۃ" سے مراد ہدایت کی دعا اور اللہ سے تعلق ہے۔ نماز بھی دراصل اسی دعا و طلب پر مشتمل ہے۔

کافر اور معنوی نشہ

کافر دراصل معنوی نشے میں ہیں، یعنی وہ ہدایت کی دعا و طلب سے غافل ہیں۔ جیسا کہ سورہ مدثر میں ان کی غفلت کو یوں بیان کیا گیا:

> مَا سَلَكَكُمْ فِي سَقَرَ ۝ قَالُوا لَمْ نَكُ مِنَ الْمُصَلِّينَ ۝ وَلَمْ نَكُ نُطْعِمُ الْمِسْكِينَ ۝ وَكُنَّا نَخُوضُ مَعَ الْخَائِضِينَ ۝ وَكُنَّا نُكَذِّبُ بِيَوْمِ الدِّينِ

(المدثر: 42–46)

یعنی وہ کھیل تماشوں میں اس قدر غافل تھے کہ ہدایت کی دعا و طلب (صلوٰۃ) نہیں کرتے تھے، اور یہ پتہ نہ لگا سکے کہ مرنے

کے بعد دوبارہ زندگی ہے اور اس کے لیے نیک اعمال مثلاً مسکین کو کھلانا ہے۔

نشہ اور صلاۃ کے قریب نہ جانا

مزید فرمایا گیا:

> يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَقْرَبُوا الصَّلَاةَ وَأَنتُمْ سُكَارَىٰ حَتَّىٰ تَعْلَمُوا مَا تَقُولُونَ

(النساء: 43)

یہ اس بات کی دلیل ہے کہ نماز اصل میں

ہدایت کی دعا و طلب ہے۔ اور شراب کے اثر

کی وجہ سے انسان اس طلب سے محروم ہو

جاتا ہے۔ جب شراب کا نشہ ختم ہوتا ہے،

تب وہ دوبارہ اپنی اصل فطرت یعنی ہدایت

کی طلب کی طرف لوٹ سکتا ہے۔

حدیث میں حرمت

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے مروی ہے

کہ جب حرمت شراب کا حکم نازل ہونا

شروع ہوا تو انہوں نے دعا کی کہ اے اللہ

! شراب کے بارے میں کوئی شافی بیان نازل

فرمائیے ، چنانچہ سورت بقرہ کی یہ آیت

نازل ہوئی ۔ " یَسْأَلُونَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ

قُلْ فِيهِمَا إِثْمٌ كَبِيرٌ " اے نبی ﷺ یہ

آپ سے شراب اور جوئے کے بارے پوچھتے

ہیں ، آپ فرما دیجئے کہ ان کا گناہ بہت

بڑا ہے ۔ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو

بلا کر یہ آیت سنائی گئی ، انہوں نے پھر

وہی دعا کی کہ اے اللہ ! شراب کے بارے

کوئی شافی بیان نازل فرمائیے ، اس پر سورت

نساء کی یہ آیت نازل ہوئی ۔ " يَا أَيُّهَا

الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَقْرَبُوا الصَّلَاةَ وَأَنتُمْ سُكَارَى "

اے ایمان والو ! جب تم نشے کی حالت

میں ہو تو نماز کے قریب نہ جاؤ اس آیت

کے نزول کے بعد نبی ﷺ کا مؤذن جب

اقامت کہتا تو یہ نداء بھی لگاتا کہ نشے

میں مدہوش کوئی شخص نماز کے قریب نہ

آئے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو بلا

کر یہ آیت بھی سنائی گئی ، لیکن انہوں

نے پھر وہی دعا کی کہ اے اللہ ! شراب

کے بارے کوئی شافی بیان نازل فرمائیے ، اس

پر سورت مائدہ کی آیت نازل ہوئی اور

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو بلا کر اس کی

تلاوت بھی سنائی گئی ، جب نبی ﷺ "

فَهَلْ أَنتُمْ مُّنتَهُونَ " پر پہنچے تو حضرت

عمر رضی اللہ

عنہ کہنے لگے کہ ہم باز آ گئے ، ہم باز آ گئے ۔

(مسند احمد 378)

حدیث میں شراب کی مذمت

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

“ ہر نشہ آور چیز خمر ہے اور ہر نشہ آور

چیز حرام ہے ، اور جس شخص نے دنیا میں

شراب پی اور اس حالت میں مر گیا کہ وہ

شراب کا عادی ہو گیا تھا اور اس نے توبہ

نہیں کی تھی تو وہ آخرت میں اسے نہیں پیے

گا ۔”

(صحیح مسلم، حدیث: 2003)

حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے

: مجھے کوئی پروا نہیں کہ میں شراب پیوں

یا اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر اس ستون کی

عبادت کروں ۔

(نسائی: 5666)

نوٹ:

یہ مندرجہ ذیل نکتہ میرا ذاتی اجتہاد ہے۔ اگر

میں نے خطا کی ہے تو اللہ تعالیٰ مجھے معاف

فرمائے، اور اگر میں حق تک پہنچا ہوں تو

یہ محض اللہ ہی کی توفیق اور فضل سے

ہے۔

شراب نوشی کے بعد غفلت اور بے فکری

اختیار کرنا ایک الگ اور مذموم رویہ ہے۔

لیکن اگر کوئی شخص گناہ کے باوجود نیک

اعمال زیادہ کرتا ہے اور اپنے گناہ پر نادم

رہتا ہے تو امید ہے کہ وہ اللہ کی مغفرت پا

سکتا ہے، اور یہ پہلو محمود ہے۔

عموماً "شرابی" اس کو کہا جاتا ہے جو شراب نوشی کو عادت بنا لے اور اس پر بے فکری اختیار کرے۔ لیکن اگر کوئی شراب نوشی کے باوجود مسلسل نیکیاں کرتا رہے اور اللہ سے غفلت نہ برتے، تو وہ مستقل اور عادی شرابی نہیں کہلائے گا، اگرچہ مرنے تک شراب پیتا رہا ہو۔

مگر مسئلہ یہ ہے کہ شراب نوشی انسان کو ہدایت کی دعا و طلب سے ہی غافل کر دیتی

ہے تو نیک اعمال کیسے کرے گا ۔ اس لئے

اس سے بچنا ضروری ہے اور اللہ سے شراب

سے پرہیز کی دعا کرتا رہے۔ توفیق عطا فرمانے

والا اللہ ہے۔ ناامید نہ ہونا۔

واللہ تعالیٰ أعلم

خلاصہ

شراب انسان کی فطری خیر و ہدایت کی

طلب کو ختم کر دیتی ہے۔ یہ اسے ذکر و

دعا سے غافل کر کے دنیاوی کھیل تماشوں

میں مشغول کر دیتی ہے۔ قرآن و سنت دونوں

میں شراب کو سختی سے حرام قرار دیا گیا

ہے اور اسے شیطانی عمل کہا گیا ہے۔ ایک

مومن کے لیے ضروری ہے کہ وہ اس سے

مکمل اجتناب کرے تاکہ اس کی ہدایت طلبی

اور اللہ سے تعلق باقی رہے۔

واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

—

ابھی فی الحال اس تحقیق میں مبتلا ہوں:

1. ایمان کی حقیقت اور ضد و عناد

✓ جو شخص قرآن و حدیث کو صحابہ کی تعلیمات کے مطابق سیکھتا ہے اور اس

میں ضد و عناد نہیں ہوتا، وہ حقیقی مومن

ہے، اور اس کے ایمان کی خصوصیت یہ ہے

کہ وہ آخرت کے عذاب سے محفوظ ہوتا ہے۔

- ✓ جو شخص قرآن و حدیث سیکھتا ہے

لیکن ضد و عناد رکھتا ہے (یعنی تکبر،

حسد، تعصب، شخصیت پرستی، آباء و اجداد

کی اندھی تقلید)، تو وہ نفاق میں مبتلا ہو

سکتا ہے۔

حدیث میں آتا ہے:

"میری امت کے اکثر منافقین قراء (قرآن پڑھنے والے) ہوں گے۔"

(مسند احمد: 16729/3796)

✅ اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ محض قرآن پڑھنا کافی نہیں بلکہ ضد و عناد سے بچنا ضروری ہے، ورنہ یہ شخص نفاق میں مبتلا ہو سکتا ہے۔ (جس میں ضد و عناد ہوتا ہے اس کا علم ناقص و غلط ہوتا

ہے وہ دین کی اصل فہم نہیں رکھ سکتا جب تک کہ ضد و عناد ہو۔)

---

2. وہ لوگ جو قرآن و حدیث کے بغیر ایمان رکھتے ہیں، چاہے بالکلیہ قرآن و حدیث کے بغیر ہو جیسے یہود و نصاری یا قرآن و حدیث کے ذریعے ہو لیکن صحابہ کی تعلیمات کے بغیر ہو۔

- ✓ اگر کوئی شخص قرآن و حدیث کے بغیر ایمان رکھتا ہے، لیکن ضد و عناد نہیں رکھتا، تو وہ عند اللہ مومن ہو سکتا ہے، لیکن ہماری نظر میں اس کا ایمان ناقص ہوگا۔

- ✓ اس کے ایمان کی وہ خصوصیت نہیں ہوگی کہ وہ آخرت کے عذاب سے محفوظ رہے، کیونکہ اس کے اندر غلط عقائد، اعمال، یا

گناہ ہو سکتے ہیں، جن کی وجہ سے وہ

محدود وقت کے لیے جہنم میں جا سکتا ہے۔

✅ 73 فرقوں والی حدیث میں بھی یہی

اصول نظر آتا ہے:

نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

"میری امت 73 فرقوں میں بٹ جائے گی، ان

میں سے ایک جنت میں ہوگا اور باقی جہنم

میں جائیں گے۔"

صحابہ نے پوچھا: "یا رسول اللہ! وہ کون

ہوگا؟"

آپ ﷺ نے فرمایا:

"وہ جو میرے طریقے اور میرے صحابہ کے

طریقے پر ہوگا۔"

(سنن ترمذی: 2641، سنن ابی داؤد: 4597)

✅ اس حدیث سے واضح ہوتا ہے کہ ناجی

فرقہ وہی ہوگا جو قرآن و حدیث کو صحابہ

کی تعلیمات کے مطابق اپنائے گا، اور اس

میں ضد و عناد نہیں ہوگا۔

✅ باقی 72 فرقے جہنم میں جا سکتے ہیں،

لیکن ضد و عناد نہ ہونے کی وجہ سے وہ

ہمیشہ کے لیے نہیں رہیں گے، بلکہ اپنے

گناہوں کی سزا بھگتنے کے بعد نکال دیے

جائیں گے۔

جن میں ضد و عناد ہو وہ ہمیشہ جہنم میں

جائیں گے ۔

---

3. خلاصہ

1 حقیقی مومن وہی ہے جو قرآن و حدیث کو صحابہ کی تعلیمات کے مطابق اپناتا ہے اور ضد و عناد سے پاک ہوتا ہے، اور ایسا مومن آخرت کے عذاب سے محفوظ ہوگا۔

2 وہ شخص جو قرآن و حدیث سے دور ہے لیکن ضد و عناد سے پاک ہے، وہ عند اللہ

مومن ہو سکتا ہے، لیکن اس پر عذاب آ سکتا ہے، اور اگر وہ گناہوں میں مبتلا رہا تو جہنم میں جا سکتا ہے، محدود وقت کے لیے۔

3 جو شخص قرآن و حدیث سیکھنے کے باوجود ضد و عناد رکھتا ہے، وہ نفاق میں جا سکتا ہے، اور نبی کریم ﷺ نے ایسے لوگوں کے بارے میں خبر دی ہے کہ اکثر منافقین قاریوں میں سے ہوں گے۔

4 73 فرقوں والی حدیث اس بات کی وضاحت کرتی ہے کہ صرف ناجی فرقہ ہی جنت میں جائے گا، جبکہ باقی فرقے جہنم میں جا سکتے ہیں، البتہ ہمیشہ کے لیے نہیں۔

فطرت کے زمانے کا بھی یہی اصول ہے۔

✓ یہ تحقیق اس امت کی منفرد خصوصیت کو واضح کرتی ہے کہ حقیقی مومن آخرت کے عذاب سے محفوظ ہوگا، جبکہ گمراہ فرقوں کے لوگ گناہوں کے سبب جہنم میں جا سکتے

ہیں، لیکن ان کا انجام آخرکار جنت ہوگا جن

میں ضد و عناد نہیں ہے۔

مرکزی ایمان: اپنی استطاعت کے مطابق ضد و

عناد کی وجوہات سے پرہیز کرنا لازم ہے۔

تکبر، حسد، تعصب، شخصیت پرستی، اور آب

و جد وجوہات ہیں ضد و عناد کی۔

واللہ تعالیٰ اعلم

(حقیقی) ایمان کی خاصیت:

اور میں (ہرقل) نے تم (ابو سفیان) سے پوچھا کہ اس کے ساتھی بڑھ رہے ہیں یا کم ہو رہے ہیں۔ تم نے کہا کہ وہ بڑھ رہے ہیں اور ایمان کی کیفیت یہی ہوتی ہے۔ حتیٰ کہ وہ کامل ہوجاتا ہے اور میں نے تم سے پوچھا کہ آیا کوئی شخص اس کے دین سے ناخوش ہو کر مرتد بھی ہوجاتا ہے تم نے کہا نہیں،

تو (حقیقی) ایمان کی خاصیت بھی یہی ہے جن

کے دلوں میں اس کی مسرت رچ بس جائے

وہ اس سے لوٹا نہیں کرتے۔

صحیح بخاری حدیث نمبر 7

> وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِيْعَ اِيْمَانَكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ

بِالنَّاسِ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ۝

“اور اللہ ایسا نہیں کہ تمہارے ایمان کو

ضائع کر دے، بے شک اللہ لوگوں پر بہت

شفقت فرمانے والا، نہایت مہربان ہے۔”

(البقرة: 143)

وَمَنۡ يُّؤۡمِنۡۢ بِاللّٰهِ يَهۡدِ قَلۡبَهٗ

ترجمہ: (التغابن - 11)

اور جو بھی کوئی شخص اللہ پر (حقیقی)

ایمان لائے وہ اس کے قلب کو ہدایت دے

دیتا ہے۔

مسئلہ: (میری تحقیق کے مطابق) حقیقی مرتد

کا وجود نہیں ہے ۔ جو مرتد ہوتا ہے وہ

سرے سے ہی مومن نہیں ہوتا بلکہ منافق ہوتا

ہے، بظاھر لوگوں کی نظروں میں مومن ہوتا ہے

ورنہ مومن حقیقی ایمان سے کفر کی طرف

نہیں لوٹا کرتا۔

ایمان سے کفر کی طرف لوٹنا منافقین کا شیوہ

ہے جیسا کہ سورۃ النساء آیت نمبر 137–138

میں ذکر ہے۔

چودہ سو سال پہلے صحابہ کے دور میں تمام

مومنین مجاہدین بھی ہوا کرتے تھے اس لئے

ان میں جب کوئی مرتد ہو جاتا تھا تو وہ

اصل میں منافق ہوتا تھا جو حربی کافروں کا

جاسوس ہوتا تھا یا اسلام کو مٹانے کے لئے

ایمان کا دعویٰ کرتا تھا یعنی حربی منافق ہوا

کرتا تھا اس لئے اس مرتد کو قتل کیا جاتا

تھا ۔ واللہ تعالیٰ اعلم

مسئلہ:

جو قصداً اپنے اختیار سے دل سے اسلام چھوڑ

کر اسلام کے علاوہ دوسرے مذہب کو حق

سمجھ کر قبول کرے تو یہ اصل میں پہلے

سے ہی منافق تھا بظاھر لوگوں کی نظروں

میں مومن تھا اس لئے اس کے پچھلے نیکیاں

پہلے سے ہی برباد تھی ، مرتد ہونے سے ظاہر

بھی ہوگیا نیکیوں کا برباد ہونا (یہ اس صورت

میں جب حالت کفر میں کوئی نیکی قبول نہ

ہوتی ہے)۔ واللہ تعالیٰ اعلم

مسئلہ:

صحابہ کرام رضی اللہ عنہ شروع سے حقیقی ایمان دار

تھے ۔ اور یہ اوپر واضح ہوگیا کہ حقیقی

ایمان کی خاصیت یہ ہے کہ اللّٰہ حقیقی ایمان کو بڑھاتا ہے لہذٰا صحابہ کرام ؓ مرتد نہیں ہوئے تھے۔

مسئلہ:

اس امت کا مومن توابین ہوتا ہے ۔ وہ قرآن و حدیث میں مذکور بعض کبیرہ گناہ مستقل طور پر نہیں کرتا ۔ (میں نے پہلے بعض ان کبیرہ گناہوں کو لکھا ہے جنہیں مستقل طور پر کرنے والا منافق ہو سکتا ہے۔)

واللہ   تعالیٰ   اعلم

وہ ایمان جو انسان کو کفر سے مومن بنائے

ایمانِ   مجمل

آمنتُ باللہِ کما ہو بأسمائہ و صفاتہ، و قبلتُ

جمیعَ احکامہ، اقرارًا باللسان و تصدیقًا بالقلب۔

ترجمہ: میں اللہ پر ایمان لایا جیسا کہ وہ

اپنے اسماء و صفات کے ساتھ ہے، اور میں

نے اس کے تمام احکام کو قبول کیا، زبان

سے اقرار اور دل سے تصدیق کے ساتھ۔

وضاحت: ایمانِ مجمل کا مفہوم یہ ہے کہ

انسان اللہ تعالیٰ کے ہر حکم کو سچ اور حق

سمجھ کر دل سے قبول کرے، اگرچہ اس پر

عمل نہ کر سکے۔ یعنی عمل نہ کرنے سے
انسان کافر نہیں بنتا، جب تک کہ دل سے
اس حکم کا انکار نہ کرے یا اسے جھٹلائے
نہیں۔ دل سے اللہ کے ہر حکم کو برحق
ماننا اور حق سمجھ کر تسلیم کر لینا، یہی
کم از کم ایمانِ مجمل ہے جو انسان کو
دائرۂ کفر سے نکال کر مومن بناتا ہے۔

اسی وضاحت کے تحت یہ بھی سمجھنا ضروری
ہے کہ:

عبادت کے مفہوم کو سمجھتے ہوئے اس نتیجے

پر پہنچنا کہ اللہ کے سوا کوئی عبادت کے

لائق نہیں ہے، یہ ایمان باللہ میں داخل ہے۔

یعنی بندہ جب غور کرے کہ عبادت صرف

اس کے لیے ہونی چاہیے جو خالق، مالک اور

مشکل کشا ہو، اور ہم اللہ کے فیصلے کے

سامنے انتہائی درجے کے عاجز اور بے بس ہیں

تو لازمی طور پر اللہ کے سوا کسی کو عبادت

کے لائق نہیں سمجھے گا، اور یہی اللہ پر

ایمان کا بنیادی تقاضا ہے۔

اللہ حاکم ہے، یعنی اللہ ہی قانون بنانے والا

اور حاکمِ مطلق ہے، اس نظام میں اللہ کا ہی

فیصلہ چلتا ہے ، جو اللہ نے چاہا ہے ویسا

ہی ہوتا ہے۔ اس لئے اللہ کے احکامات کو سچا

اور برحق سمجھ کر قبول کرنا ایمان کا حصہ

ہے۔ اس کو حق ماننا اور دل سے قبول کرنا

ایمانِ مجمل کی وضاحت میں شامل ہے۔ چاہے

بندہ عمل میں کوتاہی کرے، لیکن دل میں

اللہ کے احکامات کو سچا مانے تو وہ دائرہ ایمان میں داخل ہے۔

ایمانِ مفصل

قرآنِ کریم:

> "وَمَن يَكۡفُرۡ بِاللّٰهِ وَمَلَآئِكَتِهِ وَكُتُبِهِ وَرُسُلِهِ وَالۡيَوۡمِ الۡاٰخِرِ فَقَدۡ ضَلَّ ضَلَالًا بَعِيدًا۔" (سورة النساء: 136)

ترجمہ: اور جو کوئی اللہ، اس کے فرشتوں، اس کی کتابوں، اس کے رسولوں اور قیامت کے دن کا انکار کرے، وہ یقینا بہت دور کی گمراہی میں جا پڑا۔

وضاحت: یہ ہے ایمانِ مفصل، جس میں اللہ تعالیٰ نے ان بنیادی امور کا بیان کیا جن پر

ایمان لانا ہر انسان پر لازم ہے، اور ان کا انکار کرنا صریحِ کفر قرار دیا ہے۔

حدیثِ جبریل (علیہ السلام)

نبی کریم ﷺ سے سوال کیا گیا:

> "ایمان کیا ہے؟"

آپ ﷺ نے فرمایا:

> "یہ کہ تم ایمان لاؤ اللہ پر، اس کے
فرشتوں پر، اس کی کتابوں پر، اس کے
رسولوں پر، قیامت کے دن پر، اور تقدیر پر،
اس کے خیر و شر کے ساتھ" (صحیح مسلم:
حدیث نمبر 8)

(تقدیر اللہ کے کامل علم، قدرت ، اور فضل
و عدل کا مظہر ہے)

یہ تفصیل بھی ایمانِ مفصل کی تشریح ہے،

جس میں ایمانیات کے تمام بنیادی اجزاء کو

واضح کر دیا گیا ہے۔

قرآنِ کریم کی ایک اہم آیت

> "أَفَتُؤْمِنُونَ بِبَعْضِ الْكِتَابِ وَتَكْفُرُونَ بِبَعْضٍ؟"

(سورة البقرة: 85)

ترجمہ: تو کیا تم کتاب کے بعض حصے کو مانتے ہو اور بعض کا انکار کرتے ہو؟

وضاحت

یہ آیت ان لوگوں کے بارے میں نازل ہوئی جو جان بوجھ کر کتاب اللہ کے بعض حصے کو مانتے تھے اور بعض کا انکار کرتے تھے۔ یعنی انہیں اچھی طرح معلوم ہوتا تھا کہ یہ

بھی اللہ کی کتاب کا ہی حصہ ہے، مگر ضد، عناد اور تکبر کی بنیاد پر انکار کرتے تھے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس طرزِ عمل کو کفر قرار دیا۔

لیکن: اگر کسی شخص کو واقعی معلوم نہیں کہ کوئی چیز اللہ کی کتاب یا دین کا لازمی حصہ ہے، تو اس کا انکار کفر نہیں کہلائے گا، اگرچہ حقیقت میں وہ چیز دین یا کتاب

کا حصہ ہی ہو۔ کیوں کہ کفر وہی معتبر ہے

جو:

ضد و عناد کی بناء پر ہو۔ ضد و عناد کی

وجوہات میں تکبر ، حسد، شخصیت پرستی ،

تعصب ، آب و جد کی اندھی تقلید شامل

ہیں۔

ان وجوہات سے اپنی استطاعت کے مطابق پرہیز

کرنا ایمان کا حصہ ہے ۔

جہالت یا عدمِ علم کی وجہ سے انکار کرنا کفر شمار نہیں ہوتا، بلکہ ایسے شخص کو دلیل فراہم کر کے وضاحت کرنا ضروری ہوتا ہے۔

خلاصہ:

ایمانِ مجمل: اللہ کے ہر حکم کو سچ اور حق سمجھ کر دل سے قبول کرنا، چاہے عمل میں کمی ہو۔

عبادت کے اصل مفہوم کو سمجھ کر اللہ کے سوا کسی کو عبادت کے لائق نہ سمجھنا ایمان باللہ کا بنیادی تقاضا ہے۔

اللہ کے احکامات کو حق اور سچ سمجھ کر قبول کرنا ایمان کا حصہ ہے، اگرچہ عمل میں کمی ہو۔

ایمانِ مفصل: مخصوص عقائد اور ایمانیات کو تفصیل سے ماننا جن کا انکار کفر ہے۔

کتاب اللہ کے کسی حصے یا حکم کا انکار صرف اسی صورت کفر ہے جب ضد و عناد کے ساتھ ہو، بصورتِ دیگر لاعلمی کی بنیاد پر انکار کفر نہیں۔

واللہ تعالیٰ اعلم

—

الحمد للہ ، ایمان کا کم از کم دائرہ والا تحقیق مکمل ہو گیا ۔ ذیل میں ہے منطقی ایمان ۔

۔۔۔

منطقی ایمان (عقلی استدلال سے ایمان تک)

جب انسان آسمان و زمین کی تخلیق پر غور
کرتا ہے تو وہ خالق کے کامل علم اور قدرت
کو پہچانتا ہے۔ جب ہم دیکھتے ہیں کہ
آسمان کس طرح بلند کیا گیا، زمین کس
طرح بچھائی گئی، اور کائنات کی ہر شے کس
ترتیب اور ہم آہنگی سے اپنے کام پر لگی
ہوئی ہے — تو یقین ہو جاتا ہے کہ یہ

سب ایک ایسے خالق کی تخلیق ہے جس کا علم مکمل اور قدرت مطلق ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

> "اللہ ہی ہے جس نے سات آسمان پیدا کیے اور زمین کی بھی ان ہی کی مانند۔ اس کا حکم ان کے درمیان اترتا رہتا ہے تاکہ تم جان لو کہ اللہ ہر چیز پر پوری قدرت رکھتا ہے، اور اللہ نے ہر چیز کا علم گھیر رکھا ہے۔"

(سورۃ الطلاق، 65:12)

خالق کے اس کامل علم اور قدرت سے تقدیر
(قضا و قدر) کا تصور پیدا ہوتا ہے۔ اور
تقدیر کے اس تصور سے واضح ہوتا ہے کہ
خالق ہی تنہا بادشاہ، حاکمِ مطلق، اور قانون
بنانے والا ہے — اور اس کے فیصلوں کے
سامنے انسان بالکل بے بس اور عاجز ہے۔ یہی
"الٰہ" ہونے کا حقیقی مفہوم ہے۔

مثال کے طور پر:

ہم کسی واقعے کو "اتفاق" یا "حادثہ" اس لیے

کہتے ہیں کیونکہ ہمارا علم اور اختیار محدود

ہے۔ لیکن خالق کے لیے — جس کا علم اور

قدرت کامل ہے — کوئی بھی چیز اتفاقاً

نہیں ہوتی۔ مثلاً جب خالق نے آگ پیدا کی،

تو اس میں گرمی یا حرارت خودبخود پیدا

نہیں ہوئی، بلکہ یہ صفات خالق نے اپنے علم

و قدرت سے اس میں رکھی ہیں۔ اسی طرح

ہر چیز کی خاصیت اور مقدار کو خالق نے

اپنے ارادے اور حکمت سے مقرر کیا ہے —

یہی تقدیر ہے۔

جب انسان خالق کی حاکمیت اور الوہیت پر

ایمان لے آتا ہے تو اس کی فطرت میں

ہدایت کی تلاش کا جذبہ بیدار ہوتا ہے۔ اسی

تلاش کے دوران، وحی کی ضرورت کے تقاضے

کے مطابق، اللہ کی طرف سے رسول یا کوئی

داعی اس کے سامنے اللہ کی کتاب پیش کرتا

ہے۔ یہ خارجی ذریعہ اس کو ہدایت تک

پہنچاتا ہے۔ پھر جب وہ اس کتاب پر غور و فکر اور مطالعہ کرتا ہے تو اس کی صداقت اور سچائی اس پر خود بخود آشکار ہو جاتی ہے۔ یوں قرآن کی حقانیت ایک طرف فطرت کی طلب سے اور دوسری طرف رسول کے تعارف اور مطالعہ سے یقینی طور پر ثابت ہو جاتی ہے۔

یہاں سے آگے نقلی دلائل (یعنی وحی) کا مرحلہ شروع ہوتا ہے۔

قرآن ہمیں بتاتا ہے کہ:

خالق کا نام اللہ ہے

اللہ ہر عیب سے پاک ہے

تمام تعریفیں اسی کے لیے ہیں

وہ ہمیشہ سچ بولتا ہے

وہ دعاؤں کا جواب دیتا ہے

وہ کبھی وعدہ خلافی نہیں کرتا

وہ نیکیوں کا صلہ ضرور دیتا ہے

اللہ نہایت مہربان اور شفیق ہے

وہ معمولی نیکیوں پر بھی ابدی انعام دیتا ہے
— وہ شکور ہے

وہ کبھی ظلم نہیں کرتا... وغیرہ۔

یہ تمام حقائق صرف وحی (نقل) کے ذریعے
معلوم ہوتے ہیں، لیکن کبھی کبھی یہ انسانی
تجربے سے متصادم محسوس ہوتے ہیں۔

اسی وجہ سے وہ لوگ جو صرف عقل یا
تجربے کی بنیاد پر ایمان قائم کرتے ہیں،
اکثر الحاد (atheism) کی طرف مائل ہو جاتے
ہیں۔

جیسا کہ قرآن مجید میں اُن لوگوں کا ذکر
ہے جو اللہ کی بندگی کو بھی تجرباتی ترازو پر
تولتے ہیں:

> "اور کچھ لوگ ایسے ہیں جو اللہ کی
بندگی کرتے ہیں ایک کنارے پر رہ کر۔ پھر
اگر انہیں کوئی دنیاوی فائدہ پہنچے تو مطمئن
ہوجاتے ہیں، اور اگر کوئی آزمائش آجائے تو
منہ پھیر کر پلٹ جاتے ہیں۔ یوں وہ دنیا
بھی کھو بیٹھتے ہیں اور آخرت بھی۔ اور دنیا

و آخرت دونوں کا نقصان — یہی کھلا ہوا

نقصان ہے۔"

(سورۃ الحج، آیت 11)

ایسا ایمان آزمائش کے جھٹکوں کو برداشت

نہیں کر پاتا، کیونکہ وہ وحی کی بجائے صرف

مشاہدے اور تجربے پر کھڑا ہوتا ہے۔

مگر ایمان بالغیب کا مطلب یہ ہے کہ اگرچہ

تجربہ کسی بات کی نفی کرتا ہو، انسان پھر

بھی للہ کے کلام کو سچ مانتا ہے — محض
اس لیے کہ وہ اللہ کا کلام ہے۔

یہی وہ ایمان ہے جو روح کو پگھلا دیتا ہے،
اور اسی وجہ سے:

> ایمان کے وجود کے لیے جسمانی اعمال
ضروری نہیں — کیونکہ صرف اللہ کے فرمان
کو سچ مان لینا، اس بنیاد پر کہ وہ اللہ کا
ہے، چاہے وہ تجربے کے خلاف کیوں نہ ہو

— ایک عظیم قربانی اور غیرمعمولی ایمان کی علامت ہے۔

پھر قرآن فرماتا ہے:

> "اور جو اللہ، اس کے فرشتوں، اس کی کتابوں، اس کے رسولوں، اور یومِ آخرت کا انکار کرے، وہ یقیناً دور کی گمراہی میں جا پڑا۔"

(سورۃ النساء، 4:136)

اس آیت میں تقدیر کا الگ ذکر نہیں کیا گیا، کیونکہ اس کا ثبوت عقل و مشاہدہ سے پہلے ہی ثابت ہو چکا ہے۔

اس کے بعد قرآن و حدیث ہمیں خالق اور مخلوق میں فرق سکھاتے ہیں، جس کی تفصیل میں نے اپنے مضمون "الحمد لله" میں بیان کی ہے۔

اسی طرح فرشتوں، آسمانی کتابوں، رسولوں، اور آخرت پر ایمان کی تفصیلات بھی قرآن و

حدیث میں واضح طور پر موجود ہیں۔ تقدیر کے صحیح اور غلط استعمال کو بھی قرآن و حدیث کی روشنی میں واضح کیا گیا ہے۔

اور اللہ بہتر جانتا ہے

لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کا عقیدہ انسان کو اللہ کی رضا والے اعمال کی طرف رغبت دلاتا ہے۔

انسان اپنی خیر و بھلائی کے بارے میں

حریص ہے اور مومن کو یقین ہوتا ہے کہ

میری خیر و بھلائی اللہ کی رضامندی میں ہے

اس لئے عمل کے لئے مائل ہوتا ہے ۔

واللہ تعالیٰ اعلم

—

وحی کی ضرورت

تمہید:

انسانی عقل اپنی فطرت کے اعتبار سے خالق
کی پہچان اور بعض بنیادی اخلاقی اصولوں تک
تو پہنچ سکتی ہے، مگر یہ سفر یہاں آکر
رُک جاتا ہے۔ یہیں سے ایک اہم سوال جنم
لیتا ہے: کیا عقل اپنے بل بوتے پر حق و
باطل، خیر و شر، اور زندگی کے مقصد کی
مکمل رہنمائی دے سکتی ہے؟

تاریخِ اور انسانی تجربہ اس کا جواب نفی میں دیتا ہے۔ مختلف قوموں نے اپنی عقل اور تجربات پر بھروسہ کیا، لیکن ان کے نتائج ایک دوسرے سے متضاد نکلے۔ کچھ نے ظلم کو عدل کا نام دیا، کچھ نے نیکی کو برائی سمجھا، اور کچھ نے خواہشات کو ہی الٰہ بنا لیا۔ یہی وہ مقام ہے جہاں عقل کو وحی کی رہنمائی کی ضرورت پڑتی ہے۔

پس یہ سوال اپنی پوری شدت کے ساتھ سامنے

آتا ہے:

اگر خالق حکیم ہے اور اس نے انسان کو

بے مقصد نہیں بنایا تو کیا وہ انسان کو

ایسے ہی بغیر رہنمائی کے چھوڑ دے گا؟

یقیناً نہیں۔ بلکہ اس کی حکمت کا تقاضا ہے

کہ وہ وحی نازل کرے تاکہ انسان کو صحیح

اور قطعی ہدایت مل سکے۔

وحی کی ضرورت کے دلائل و نکات:

1. عقل کی حدود

عقل انسان کو بعض بنیادی حقائق تک تو پہنچا دیتی ہے، جیسے:

خالق کا ہونا (کہ ایک اللہ ہے)

بعض اخلاقی اصول (انصاف اچھا ہے، ظلم برا ہے)

لیکن عقل تفصیلات اور عملی حدود طے کرنے سے قاصر ہے۔ مثلاً:

نماز کتنی بار ہونی چاہیے؟

روزہ کب رکھا جائے اور کس طرح رکھا جائے؟

وراثت کی تقسیم کیسے ہوگی؟

یہ سب عقل سے طے نہیں کیا جا سکتا،

اس کے لیے وحی ضروری ہے۔

📖 قرآن میں ہے:

"وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِينَ حَتَّىٰ نَبْعَثَ رَسُولًا" (بنی

اسرائیل: 15)

یعنی اللہ عقل کے ساتھ ساتھ رسول اور وحی

بھیجتا ہے تاکہ دلیل مکمل ہو۔

---

2. عقل کا اختلاف

عقل کا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ ہر شخص کی عقل مختلف نتیجہ دے سکتی ہے۔

کچھ لوگ شراب کو فائدہ مند سمجھتے ہیں۔

کچھ لوگ اسے تباہ کن سمجھتے ہیں۔

اگر وحی نہ ہو تو عقل کی بنیاد پر کوئی حتمی معیار قائم نہیں ہو سکتا۔

---

3. انسانی خواہشات کا غلبہ

صرف عقل پر چھوڑ دیا جائے تو انسان اپنی خواہشات کے مطابق دلیلیں گھڑ لیتا ہے۔

بعض اقوام نے بچوں کو قربانی میں ذبحِ کرنا

نیکی سمجھا۔

بعض نے عورت کو حقیر سمجھ کر اس کے

حقوق سلب کیے۔

یہ سب عقل کے نام پر ہی ہوا۔

وحی ایک مکمل اور محفوظ معیار دیتی ہے جو

خواہشات سے ماورا ہے۔

---

4. ہدایت کا امتحان

وحی کے بغیر عقل کا امتحان ادھورا ہے۔

عقل یہ بتاتی ہے کہ "مجھے کچھ اعلیٰ مقصد کے لیے بنایا گیا ہے"۔

لیکن یہ مقصد وحی کے ذریعے واضح کیا جاتا ہے۔

اللہ نے ہر چیز کو ایک خاص مقصد کے لیے بنایا ہے۔ اگر وہ مقصد پورا نہ ہو تو عبث ہے۔

عقل کا مقصد یہ ہے کہ حق کو پہچانے، اور وحی کے بغیر عقل کا یہ مقصد ادھورا رہ جاتا ہے۔

---

5. غیب کا علم

عقل صرف ظاہر کو جان سکتی ہے، غیب کو نہیں۔

جنت و جہنم کی حقیقت

موت کے بعد کی زندگی

فرشتوں اور آخرت کے امور

یہ سب عقل کے دائرے سے باہر ہیں۔

اس کے لیے وحی کی ضرورت ہے۔

---

6. جزئیات کی رہنمائی

عقل کلیات کو سمجھ سکتی ہے لیکن جزئیات میں رہنمائی نہیں دے سکتی۔

اخلاقی اصول کی بنیاد عقل سے سمجھ میں آتی ہے کہ انصاف ضروری ہے۔

لیکن انصاف کو عملی زندگی میں نافذ کرنے کے تفصیلی قوانین صرف وحی بتاتی ہے۔

---

7. عبد و معبود کا تعلق

عقل یہ سمجھ لیتی ہے کہ ایک خالق ہے اور انسان اس کا بندہ ہے۔

لیکن بندگی کی عملی صورت (عبادات و اعمال)

کیا ہوں گی؟

یہ وحی کے بغیر ممکن نہیں۔

اسی لیے نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حجِ جیسے

اعمال وحی کے ذریعے ہی متعین ہوئے۔

---

8. وحی معیارِ حق

عقل اکیلی ہو تو "کثرتِ آراء" (ہر شخص کی

رائے الگ) پیدا ہو جاتی ہے۔

وحی سب اختلافات ختم کر کے ایک حتمی

معیار فراہم کرتی ہے۔

اسی لیے اللہ نے فرمایا:

"فَإِن تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللَّهِ وَالرَّسُولِ"

(النساء: 59)

---

۹. نفع و نقصان اور خیر و شر کا فرق

نفع و نقصان کا تعلق ظاہر سے ہے، جو تجربات اور مشاہدات (عقل) کے ذریعے معلوم ہو سکتے ہیں۔

لیکن خیر و شر کا تعلق غیب و باطن سے ہے، جس کا علم عقل کی دسترس سے باہر ہے۔

مثلاً شراب:

اس میں کچھ ظاہری نفع ہے (کاروبار، وقتی خوشی)۔

لیکن اس کا گناہ اور تباہی (باطنی و اخروی شر) زیادہ ہے۔

جیسا کہ قرآن میں فرمایا گیا:

"قُلْ فِيهِمَا إِثْمٌ كَبِيرٌ وَمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَإِثْمُهُمَا أَكْبَرُ مِن نَّفْعِهِمَا" (البقرة: 219)

یعنی نفع عقل کو نظر آ سکتا ہے، لیکن شر اور گناہ کا فیصلہ وحی ہی بتا سکتی ہے۔

10. اجتماعی زندگی کا نظام

اگر وحی نہ ہو تو ہر معاشرہ اپنی عقل کے مطابق الگ الگ قانون بناتا ہے۔ نتیجہ:

کوئی قوم سود کو معیشت کا اصول مانتی ہے

کوئی قوم ہم جنس پرستی کو "حق" کہتی ہے

کوئی قوم ذات پات کا نظام قائم کرتی ہے

عقل اکیلی کبھی بھی عالمی اور ابدی معیار نہیں دے سکتی۔ وحی ہی ہے جو ایک "universal guidance" فراہم کرتی ہے۔

قرآن میں ہے:

"كان الناس أمة واحدة فبعث الله النبيين مبشرين ومنذرين وأنزل معهم الكتاب بالحق ليحكم بين الناس فيما اختلفوا فيه" (البقرة: 213)

لوگ ایک امت تھے، پھر اللہ نے ان کے اختلافات ختم کرنے کے لیے انبیاء اور کتاب نازل کی۔

11. عقل کا اپنا تقاضا وحی کی طرف

عقل خود کہتی ہے کہ میرا کام صرف سوال اٹھانا اور راستہ دکھانا ہے، حتمی جواب دینا نہیں۔

جیسے آنکھ روشنی کی تلاش کرتی ہے لیکن روشنی خود آنکھ کے باہر سے آتی ہے۔
اسی طرح عقل "وحی کی تلاش" کرتی ہے، اور وحی وہ روشنی ہے جو اسے مکمل کرتی ہے۔

خلاصہ:

وحی اس لیے ضروری ہے کہ عقل محدود ہے،

مختلف ہے، خواہشات سے مغلوب ہو سکتی ہے،

اور غیب و باطن تک رسائی نہیں رکھتی۔

وحی عقل کو رہنمائی دیتی ہے اور انسان کو

اس کا حقیقی مقصدِ زندگی دکھاتی ہے۔

قرآن سے نقلی دلائل

1. القيامة: 36

﴿ أَيَحْسَبُ الْإِنسَانُ أَن يُتْرَكَ سُدًى ﴾

"کیا انسان یہ گمان کرتا ہے کہ اسے یوں ہی بے کار چھوڑ دیا جائے گا؟"

---

2. بنی اسرائیل: 15

﴿ وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِينَ حَتَّىٰ نَبْعَثَ رَسُولًا ﴾

"اور ہم عذاب دینے والے نہیں جب تک کہ کوئی رسول نہ بھیج دیں۔"

3۔ النساء: 165

﴿ رُّسُلًا مُّبَشِّرِينَ وَمُنذِرِينَ لِئَلَّا يَكُونَ لِلنَّاسِ عَلَى اللَّهِ حُجَّةٌ بَعْدَ الرُّسُلِ ﴾

"رسول خوشخبری دینے والے اور ڈرانے والے بنا کر بھیجے گئے تاکہ رسولوں کے بعد لوگوں کے پاس اللہ کے خلاف کوئی حجت باقی نہ رہے۔"

---

4. الأنعام: 19

﴿ وَأُوحِيَ إِلَيَّ هَٰذَا الْقُرْآنُ لِأُنذِرَكُم بِهِ وَمَن بَلَغَ ﴾

"اور یہ قرآن میری طرف وحی کیا گیا ہے

تاکہ میں اس کے ذریعے تمہیں اور جس تک

یہ پہنچے اسے ڈراؤں۔"

---

5. الأنبياء: 10

﴿ لَقَدْ أَنزَلْنَا إِلَيْكُمْ كِتَابًا فِيهِ ذِكْرُكُمْ أَفَلَا

تَعْقِلُونَ ﴾

"بیشک ہم نے تمہاری طرف ایک کتاب نازل کی ہے جس میں تمہارا ذکر ہے، کیا تم عقل نہیں رکھتے؟"

—

6. مقصدِ تخلیق اور وحی کی ضرورت

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ﴾

”اور میں نے جنوں اور انسانوں کو صرف اپنی عبادت کے لیے پیدا کیا ہے۔“ (الذاریات: 56)

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ تخلیق کا اصل مقصد عبادت ہے۔ لیکن عبادت کے طریقے وہی معتبر اور منظور ہوں گے جو اللہ اپنی وحی کے ذریعے بتائے، کیونکہ اصل حاکم اور معبود صرف اللہ ہے۔ اگر انسان اپنی عقل یا خواہش سے عبادت کے طریقے گھڑ لے تو وہ

باطل قرار پائیں گے، جیسے قرآن نے مشرکین
کی عبادات کو باطل کہا۔

واللہ تعالیٰ اعلم

—

وحی پر اعتماد

تمہید

انسان کے لیے سب سے اہم سوال یہ ہے کہ

کیا اسے وحی پر اعتماد کرنا چاہیے؟

کیا یہ بیوقوفی ہے یا عقل کی روشنی میں

درست فیصلہ؟

یہ مضمون اس سوال کا جواب دیتا ہے کہ

وحی پر ایمان دراصل عقل کا تقاضا ہے۔

کیونکہ اللہ تعالیٰ لامحدود علم اور حکمت کا مالک ہے، جب کہ انسان محدود عقل رکھتا ہے۔

🌿 نکات / مرکزی دلائل:

1. **اللہ لامحدود علم و اختیار کا مالک ہے**

اللہ نے لامحدود ممکنات میں سے موجودہ نظامِ

تقدیر کا انتخاب کیا ہے۔

یہ انتخاب علم، حکمت، فضل اور عدل پر

مبنی ہے۔

انسان ان ممکنات کو نہیں جانتا، اس لیے

اس کا فہم جزوی اور ناقص ہے۔

چنانچہ وحی پر اندھا اعتماد بیوقوفی نہیں بلکہ

عقل کی پختگی ہے۔

2. انسان کا محدود ادراک

انسان صرف ظاہری اسباب و نتائج تک پہنچ سکتا ہے، جبکہ اللہ ظاہر و باطن دونوں کا علم رکھتا ہے۔

اس لیے جو حکم اللہ وحی کے ذریعے دیتا ہے، وہ اس کے علمِ کامل پر مبنی ہوتا ہے، چاہے بظاہر انسان کو اس کی حکمت سمجھ نہ آئے۔

3. تجربہ اور مشاہدہ بھی محدود ہے

عقل اور تجربہ وقت اور جگہ کی قید میں

ہیں۔

وحی ان حدود سے ماورا رہنمائی دیتی ہے، اسی

لیے وحی پر بھروسہ عقل کے خلاف نہیں بلکہ

عقل سے بالاتر یقین ہے۔

4. وحی پر اعتماد، عقل کی تکمیل ہے

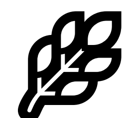
عقل کا کام یہ ہے کہ وہ حق کی تلاش

کرے، اور جب وحی سے حق ظاہر ہو جائے

تو اسے تسلیم کرے۔

لہٰذا وحی کا انکار کرنا عقل کی بغاوت ہے،

اور اس پر اعتماد کرنا عقل کی تکمیل۔

 **نتیجہ:**

وحی پر اندھا اعتماد بیوقوفی نہیں، بلکہ اس
یقین کی بنیاد اللہ کی لامحدود حکمت، علم،
اور قدرت پر ہے۔

جب انسان اپنی محدود عقل کا اعتراف کر
کے خالق کی وحی کو مان لیتا ہے، تو یہی
عقلی شعور اور ایمان کا اعلیٰ درجہ ہے۔

واللہ تعالیٰ اعلم

اللہ کے کمالِ علم و قدرت — خطا اور کمی سے پاک

تمام تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لیے ہیں، جو ہر چیز کو جاننے والا، ہر چیز پر قدرت رکھنے والا، اور اپنے ہر فیصلے میں کامل حکمت والا ہے۔

اس کا علم ازل سے ابد تک ہر حقیقت کو
گھیرے ہوئے ہے۔
اس کی قدرت ہر شے پر غالب ہے۔
اس کے فیصلے خطا اور کمی سے پاک ہیں۔

اے لوگو! ہمارا علم محدود ہے، ہمارا مشاہدہ
ناقص ہے، اور ہمارا تجربہ خطا سے بھرا ہوا
ہے، لیکن اللہ کا علم کامل اور اس کی
قدرت بے عیب ہے۔ وہ کبھی غلط فیصلہ
نہیں کرتا اور کبھی کسی پر ظلم نہیں کرتا۔

تقدیر کی حقیقت — صحیحین کی روایت

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

> "آدمی جنت والوں کے عمل کرتا رہتا ہے
> یہاں تک کہ اس کے اور جنت کے درمیان
> ایک ہاتھ کا فاصلہ رہ جاتا ہے، پھر اس پر
> تقدیر غالب آتی ہے اور وہ جہنم والوں کے
> عمل کرنے لگتا ہے اور جہنم میں داخل ہو

جاتا ہے۔ اور آدمی جہنم والوں کے عمل کرتا

رہتا ہے یہاں تک کہ اس کے اور جہنم کے

درمیان ایک ہاتھ کا فاصلہ رہ جاتا ہے، پھر

اس پر تقدیر غالب آتی ہے اور وہ جنت

والوں کے عمل کرنے لگتا ہے اور جنت میں

داخل ہو جاتا ہے۔"

(بخاری 3208، مسلم 2643)

اس حدیث کے دو معانی ہیں:

1. ظاہری معنی: ایسا شخص بظاہر نیک اعمال کرتا ہے لیکن اللہ کے علم میں وہ جہنمی ہے، کیونکہ وہ دراصل منافق ہے۔

2. گہرا مفہوم: یہ اللہ کے کمالِ علم و قدرت کی دلیل ہے کہ تمہاری آنکھیں دھوکہ کھا سکتی ہیں، تمہارا تجربہ غلط ہو سکتا ہے، مگر اللہ کا علم کبھی خطا نہیں کرتا۔

دوسرے مفہوم میں دو پہلو ہیں: ہمارے تجربے اور مشاہدے کے مطابق اگر کسی کا

فاصلہ جنت کے قریب ہو جائے تو ہمارا

تجربہ غلط ثابت ہو سکتا ہے، کیونکہ اللہ کا

علم خطا سے پاک ہے۔ لیکن اگر حقیقت

میں کوئی شخص جنت کے قریب پہنچ جائے،

تو پھر یہ صورت ایک فرضی مثال ہی بن

جاتی ہے، کیونکہ اللہ اس کے ایمان کو مزید

بڑھا دیتا ہے۔

جیسا کہ اللہ کا ارشاد ہے:

> وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِيْعَ اِيْمَانَكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ

بِالنَّاسِ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ۞

"اور اللہ ایسا نہیں کہ تمہارے ایمان کو

ضائع کر دے، بے شک اللہ لوگوں پر بہت

شفقت فرمانے والا، نہایت مہربان ہے۔"

(البقرة: 143)

> وَمَنْ يُّؤْمِنْ بِاللّٰهِ يَهْدِ قَلْبَهٗ

“اور جو کوئی (سچے دل سے) اللہ پر ایمان رکھتا ہے تو اللہ اس کے دل کو ہدایت (کے نور) سے نواز دیتا ہے۔”

(التغابن: 11)

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

> “میں (ہرقل) نے تم سے پوچھا تھا کہ کیا کوئی شخص اس کے دین سے ناخوش ہو کر مرتد بھی ہو جاتا ہے؟ تم نے کہا: نہیں۔ تو ایمان کی خاصیت بھی یہی ہے کہ جن کے

دلوں میں اس کی مسرت رچ بس جائے وہ اس سے واپس نہیں پلٹتے۔"

(صحیح البخاری: 7)

اور سورة النساء کی آیات 137–138 میں بھی یہی اشارہ ہے کہ مرتد ہونے والا دراصل منافق ہوتا ہے، جو بس کفر کے اظہار سے ظاہر ہو جاتا ہے۔

واللہ تعالیٰ أعلم

ﷲ کا فیصلہ — مٹھیوں والی حدیث

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول ﷲ ﷺ نے فرمایا:

> "اللہ عزوجل نے ایک مٹھی بھری اور فرمایا: یہ جنت میں میری رحمت کے ساتھ، اور ایک دوسری مٹھی بھری اور فرمایا: یہ جہنم میں، اور مجھے ذرا بھی پرواہ نہیں۔"

(السلسلة الصحيحة: 47، مسند أبي يعلى: 3359)

اللہ کا علم و قدرت ایسا ہے کہ اسے فضل و عدل کا فیصلہ کرنے کے لیے سوچنا نہیں پڑتا۔ مخلوق سوچتی ہے کہ کہیں غلط نہ ہو جائے، لیکن اللہ کا فیصلہ ہر حال میں عین حق اور عدل ہوتا ہے۔

دنیا اور آخرت کا فرق

دنیا میں ایسا ہو سکتا ہے کہ کوئی شخص

دن رات محنت کرے اور ناکام ہو جائے،

کیونکہ دنیا کے نتائج اللہ کی مشیت کے تابع

ہیں — جتنا چاہے اور جسے چاہے دے۔

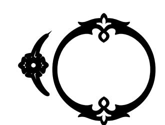
لیکن آخرت میں ایسا نہیں ہوگا۔ وہاں جزا

نیت، اخلاص، محنت اور صبر کے مطابق

ہوگی۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

> ﴿مَّن كَانَ يُرِيدُ الْعَاجِلَةَ عَجَّلْنَا لَهُ فِيهَا مَا نَشَاءُ لِمَن نُّرِيدُ ثُمَّ جَعَلْنَا لَهُ جَهَنَّمَ يَصْلَاهَا مَذْمُومًا مَّدْحُورًا ۝ وَمَنْ أَرَادَ الْآخِرَةَ وَسَعَىٰ لَهَا سَعْيَهَا وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَأُولَٰئِكَ كَانَ سَعْيُهُم مَّشْكُورًا



(الإسراء: 18–19)

ترجمہ:

جو کوئی (صرف) دنیا ہی چاہتا ہے، ہم اس کو یہیں دے دیتے ہیں جو کچھ ہمیں دینا ہوتا ہے، جس کو دینا ہوتا ہے، پھر جہنم ہی

کو اس کا مقسوم بنا دیتے ہیں، جس میں

اسے داخل ہونا ہوگا بدحال اور خوار ہو کر،

اور (اس کے برعکس) جو کوئی آخرت

(لامحدود اجر) کا طلب گار ہوگا، اور اس کے

لئے وہ ایسی کوشش بھی کرے گا جیسی

کوشش کہ اس کے لئے کرنی چاہیے، بشرطیکہ

وہ ایماندار بھی ہو، تو ایسے لوگوں کی کوشش

مقبول ہوگی۔

مَا نَشَاءُ لِمَن نُّرِيدُ سے مراد جتنا میں چاہوں

اور جس کو میں چاہوں ۔ یہ دنیا کا معاملہ

ہے ۔۔

"مَشْكُورًا" کا مطلب ہے کہ اللہ اپنی شان کے

مطابق اس محنت و صبر کی قدر کرے گا

— ایسا اجر جو کبھی ختم نہ ہو۔ یہ

آخرت کا معاملہ ہے ۔

تقدیر اور رحمت کا نکتہ

یاد رکھو! جنت میں جانا اللہ کا فضل ہے،

جہنم میں جانا اللہ کا عدل ہے۔

نیک اعمال کی توفیق بھی اللہ کی رحمت سے ہے۔

جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

> "کسی کو بھی اس کے اعمال جنت میں داخل نہیں کریں گے... یہاں تک کہ میں

بھی نہیں، مگر یہ کہ اللہ اپنی رحمت سے

مجھے ڈھانپ لے۔"

(بخاری 5673، مسلم 2816)

لہٰذا اصل کامیابی اللہ کی رحمت پر موقوف ہے،

اگرچہ اعمال اور صبر اس رحمت کو حاصل

کرنے کا ذریعہ و سبب ہیں۔

جیسا کہ آیات سے ظاہر ہوتا ہے (بِمَا

صَبَرُوْا)

وَجَزٰىهُمۡ بِمَا صَبَرُوۡا جَنَّةً وَّحَرِيۡرًا ۙ ۝

ترجمہ:

اور ان کو سرفراز فرما دیا ہوگا اس نے (اپنی رحمت و عنایت سے) عظیم الشان جنت اور ریشمی لباس سے اس بناء پر کہ انہوں نے (زندگی بھر) صبر سے کام لیا (راہ حق و صواب پر)

سورۃ الانسان – 12

أُولَٰٓئِكَ يُجۡزَوۡنَ ٱلۡغُرۡفَةَ بِمَا صَبَرُواْ وَيُلَقَّوۡنَ فِيهَا

تَحِيَّةٗ وَسَلَٰمًا ۝

ترجمہ:

یہی ہیں وہ لوگ جن کو جنت کی وہ منزل

بلند نصیب ہوگی اس لیے کہ انہوں نے زندگی

بھر راہ حق پر صبر و استقامت سے کام لیا

ان کا وہاں پر دعا وسلام سے استقبال کیا

جائے گا

الفرقان – 75

ظلم سے پاک فیصلہ

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

> وَمَا رَبُّكَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيدِ

"اور تیرا رب بندوں پر ظلم کرنے والا نہیں ہے۔" (فصلت: 46)

اور حدیثِ قدسی میں فرمایا:

> "اے میرے بندو! میں نے ظلم کو اپنی ذات پر حرام کر دیا ہے اور تمہارے درمیان بھی اسے حرام قرار دیا ہے، پس تم ایک دوسرے پر ظلم نہ کرو۔"

(مسلم 6572)

دعا

اے اللہ! ہمیں اپنے علم اور قدرت پر کامل

یقین عطا فرما۔

ہمیں اپنے فضل و رحمت سے ڈھانپ لے۔

ہماری زندگی اور موت ایمان پر لکھ دے، اور

قیامت کے دن ہمیں اپنے فضل سے جنت میں

داخل فرما۔

آمین یا رب العالمین۔

واللہ تعالیٰ اعلم

فضیلتِ صحابہ اور اہلِ ایمان کا حقیقی مقام

قرآن میں اللہ تعالیٰ نے سورۃ الفتح (آیت 18) میں فرمایا:

> لَقَدْ رَضِيَ اللَّهُ عَنِ الْمُؤْمِنِينَ إِذْ يُبَايِعُونَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ فَعَلِمَ مَا فِي قُلُوبِهِمْ فَأَنزَلَ السَّكِينَةَ عَلَيْهِمْ وَأَثَابَهُمْ فَتْحًا قَرِيبًا

”بے شک اللہ اُن مومنوں سے راضی ہو گیا

جب انہوں نے درخت کے نیچے آپ ﷺ سے

بیعت کی۔ اللہ اُن کے دلوں کے اندر جو

کچھ تھا اسے جانتا تھا، اس لیے اُن پر

سکون نازل فرمایا اور اُنہیں قریب فتح سے

نوازا۔“

اس آیت میں دو عظیم نکتے چھپے ہیں:

1. اللہ نے اُن کے باطن سے باخبر ہونے کے باوجود اُن سے راضی ہونے کا اعلان کیا۔

2. یہ سب اُس وقت ہوا جب اللہ تعالیٰ کے علم میں اُن کا مستقبل بھی معلوم تھا۔

اگر — جیسے کہ روافض کہتے ہیں — صحابہ بعد میں مرتد ہو گئے ہوتے، تو یہ اللہ کے علم میں پہلے سے موجود ہوتا۔ پھر اللہ اُن سے راضی ہونے کا اعلان نہ کرتا بلکہ ”منافق“ کا لفظ استعمال کرتا۔

لیکن قرآن نے اُن کے لیے ”رضي الله عنهم“ کا استعمال کیا، جو قطعی اور دائمی رضا (ہمیشہ کی خوشنودی) کا اظہار ہے۔

اصلی مرتد اور منافق کا فرق

سورة النساء (آیات 137–138) میں اللہ فرماتا ہے:

> إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا ثُمَّ كَفَرُوا ثُمَّ آمَنُوا ثُمَّ كَفَرُوا ثُمَّ ازْدَادُوا كُفْرًا لَمْ يَكُنِ اللَّهُ لِيَغْفِرَ لَهُمْ وَلَا لِيَهْدِيَهُمْ سَبِيلًا۔ بَشِّرِ الْمُنَافِقِينَ بِأَنَّ لَهُمْ عَذَابًا أَلِيمًا

”یقیناً وہ لوگ جو ایمان لائے، پھر کفر کر بیٹھے، پھر ایمان لائے، پھر پھر سے کفر کر لیا، اور پھر اپنے کفر میں اور بڑھتے چلے گئے — اللہ کبھی اُنہیں معاف نہیں کرے گا، اور نہ اُنہیں کسی راستے کی ہدایت دے گا۔

(اے نبی ﷺ) اُن منافقوں کو خوشخبری سنا دو کہ اُن کے لیے دردناک عذاب ہے۔“

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جو بار بار ایمان اور کفر کے درمیان گھومتے ہیں، وہ اصل میں منافق ہوتے ہیں، نہ کہ مومن یا صحابی۔

یعنی حقیقی مرتد کا وجود ہی نہیں، بلکہ وہ لوگ پہلے سے نفاق میں ہوتے ہیں۔

قرآن میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

> وَمَا كَانَ اللَّهُ لِيُضِيعَ إِيمَانَكُمْ

”اور اللہ ایسا نہیں کہ تمہارا ایمان ضائع کر دے۔“

(سورة البقرہ، 2:143)

اور ایک اور جگہ فرمایا:

> وَمَن يُؤْمِن بِاللَّهِ يَهْدِ قَلْبَهُ

”جو شخص اللہ پر ایمان لاتا ہے، اللہ اُس کے دل کو ہدایت دے دیتا ہے۔“

📖 (سورۃ التغابن، 64:11)

ان دونوں آیات سے یہ واضح ہوتا ہے کہ جو سچے دل سے ایمان لاتا ہے، اللہ اُس کے دل کو ہدایت اور استقامت عطا کرتا ہے۔

یعنی ایمان ایک دائمی نور ہے، اور اللہ اپنے دیے ہوئے نور کو ضائع نہیں کرتا۔

اس لیے اگر کوئی بعد میں ”مرتد“ دکھائی دے، تو اصل میں وہ کبھی حقیقتاً مومن تھا ہی نہیں — بلکہ اُس کے دل میں نفاق چھپا ہوتا ہے، جس کا اظہار بعد میں ہوتا ہے۔

یہی قرآن کا اصول ہے کہ ”ارتداد نفاق کا ظہور ہے، ایمان کا زوال نہیں۔“

اسی حقیقت کو ہِرقل — جو روم کا

بادشاہ تھا — نے بھی سمجھا تھا، جب اُس

نے ابو سفیانؓ سے پوچھا:

> "کیا اُن (مسلمانوں) کا کوئی شخص ایمان

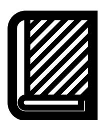
لانے کے بعد واپس کفر میں گیا؟"

ابو سفیانؓ نے کہا: "نہیں۔"

تو ہرقل نے کہا:

"یہی ایمان کی حقیقت ہے، جب وہ دل میں

بیٹھ جائے تو واپس نہیں جاتا۔"

 (صحیح البخاری، حدیث نمبر 7)

یہ قول بھی اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ

سچا ایمان کبھی پلٹ نہیں سکتا۔

اس لیے قرآن کے مطابق ”مرتد“ وہ نہیں جو

پہلے مومن تھا، بلکہ وہ ہے جو پہلے سے نفاق

میں چھپا ہوا تھا، جیسا کہ سورۃ النساء

(آیات 137–138) میں بیان ہوا۔

روافض کا گمراہ عقیدہ

روافض کا یہ کہنا کہ ”اللہ کو بعد میں پتا چلتا ہے“ (یعنی اللہ کو بَدَاء ہوتی ہے) —— یہ شدید کفر اور شرک ہے۔

ﷲ تعالیٰ ازل سے ہر چیز کا علم رکھتا ہے۔ اسے نتائج کا علم بھی پہلے سے ہوتا ہے، اس لیے اس کے فیصلے کبھی ”نتیجہ دیکھ کر“ نہیں بدلتے۔ بلکہ ہر فیصلہ اپنے دور اور حالات کے مطابق ہوتا ہے —— جیسے منسوخ

اور ناسخ احکام میں ہوتا ہے۔ یہ تبدیلی کسی غلطی کی وجہ سے نہیں بلکہ حکمت اور دور کے تقاضوں کے مطابق ہوتی ہے، اور یہ سب اللہ کو ازل سے معلوم ہوتا ہے۔

> وَاللَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ

”اور اللہ ہر چیز کا علم رکھتا ہے۔“

اس لیے صحابہ کے بارے میں شک کرنا یا

اُن پر الزامات لگانا اصل میں اللہ کی رضا

کا انکار ہے، نہ کہ صرف صحابہ کا۔

صحابہ کرام کی نیکیوں کا حساب اور اندازہ

صحیح مسلم میں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے

فرمایا:

> مَنْ سَنَّ فِي الإِسْلاَمِ سُنَّةً حَسَنَةً فَلَهُ أَجْرُهَا، وَأَجْرُ مَنْ عَمِلَ بِهَا بَعْدَهُ

”جو شخص اسلام میں کسی نیک طریقے کا آغاز کرے تو اس کے لیے اس کا اجر ہے اور ان سب کا بھی اجر ہے جو اس پر عمل کریں گے اس کے بعد۔“

(صحیح مسلم، حدیث 1017)

> «مَن دَلَّ عَلَى خَيْرٍ فَلَهُ مِثْلُ أَجْرِ فَاعِلِهِ»

”جو کسی کو کسی بھلے (نیک) کام کی طرف رہ دِکھائے، تو اُس کو بھی اُس عمل کرنے والے کے برابر اجر ملتا ہے۔“

(صحیح مسلم، حدیث نمبر 1893)

اور قرآن میں اللہ تعالیٰ نے جہاد کے بارے میں فرمایا:

> وَلَوْلَا دَفْعُ اللَّهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَصَلَوَاتٌ وَمَسَاجِدُ يُذْكَرُ فِيهَا اسْمُ اللَّهِ كَثِيرًا

”اگر اللہ بعض لوگوں کے ذریعے دوسروں کو دفع نہ کرتا تو خانقاہیں، گرجے، کلیسا اور مسجدیں جہاں اللہ کا بہت ذکر کیا جاتا ہے، سب منہدم کر دی جاتیں۔“

🕮 (سورۃ الحج، 22:40)

ان دلائل کی بنا پر قیامت تک قرآن و

حدیث پر جتنا بھی عمل ہوتا رہے گا، وہ

صحابہ کرام کے عمل نامے میں لکھا جاتا

رہے گا۔

اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ صحابہ

کی نیکیاں کتنی بے شمار ہیں۔

اور حساب یوں ہوگا کہ گناہ نیکیوں کے بدلے

مٹایا جائے گا۔

جب نیکیاں ختم ہو جائیں تو اللہ چاہے تو

باقی ماندہ گناہوں کی سزا دے یا بغیر سزا

کے معاف فرما دے۔

اسی لیے صحابہ کرام کے گناہ انہیں نقصان

نہیں پہنچا سکتے، کیونکہ ان کی نیکیاں بے

انتہا ہیں۔

اگر ان کے درمیان کوئی اختلافات بھی ہوئے

ہیں تو وہ اللہ کے فضل سے معاف ہیں۔

اور ایک اضافی بات یہ ہے کہ تمام صحابہ

اور مسلمانوں کی نیکیاں نبی کریم ﷺ کے

عمل نامے میں بھی لکھی جاتی ہیں، کیونکہ

آپ ﷺ ذریعہ ہیں۔

اسی لیے نبی کریم ﷺ مخلوق میں سب سے

اعلیٰ درجے پر ہیں، کہ آپ ﷺ کے نیکیاں

سب سے زیادہ ہیں۔

> إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ

”بیشک تم میں سب سے زیادہ عزت والا وہ

ہے جو سب سے زیادہ پرہیزگار ہے۔“

(سورۃ الحجرات، 49:13)

اور یہاں تقویٰ سے مراد عقلی تقویٰ یعنی

نیکوکاری ہے (مفہوم البقرہ 21) — جو سب

سے زیادہ نبی کریم ﷺ میں پائی جاتی ہے۔

【اہم: صحابہ کرام کے گناہ انہیں نقصان نہیں پہنچا سکتے۔】

رِوافض اکثر صحابہ کے گناہوں کو تنقید کے ٔنیت سے اُٹھاتے ہیں، مگر واضح ہونا چاہیے کہ انسان سے معصوم ہونے کا تقاضا کبھی نہیں ہوا بلکہ مغفرت کا تقاضا ہوا ہے۔
صحابہ کرام کے گناہوں کا ذِکُر محض تعلیم کی نیت سے یا حوالۂ تاریخی یا اصلاحی نقطۂ نظر سے ہو سکتا ہے، مگر اس بات کا مطلب

ہرگز یہ نہیں کہ وہ اعمال ان کے لیے

نقصان کا باعث بن جائیں۔

فرضی مثال: فرض کریں کہ کوئی صحابی زندہ

ہو جائے یعنی اس دنیا میں لوٹایا جائے اور

کسی دن غلطی سے یا پلِ صدمے میں قتلِ

ناحق کا ارتکاب کر بیٹھتا — جو کہ ایک

بہت بڑا گناہ ہے۔ اس صورت میں یہ بات

نہ تو یہ کہتی ہے کہ قتل ناحق معمولی ہے

اور نہ ہی یہ کہ اس طرح کے فعل کا اِذن

ہے۔ بلکہ اس کا مفہوم یہ ہوگا کہ صحابہ

کرام کی نیکیاں اتنی وسیع اور بہتات ہیں کہ

قیامت تک جو بھی قیامِ عمل (قرآن و

حدیث کی روشنی میں جاری ثواب و اثر) ان

کی وجہ سے لکھا جاتا رہے گا، وہ ان

نافرمانیوں کے مقابلے میں غالب رہ سکتی ہیں؛

یوں ان کے گناہ اُنہیں نقصان پہچانے کے

قابل نہ رہیں ۔

نتیجہ

صحابہ رضی اللہ عنہ کے دلوں کا علم اور اُن پر اللہ کی رضا قرآن سے ثابت ہے۔

اُن کے بارے میں بدگمانی صرف جہالت کا نتیجہ ہے۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ جیسے اصحاب جنہوں نے "بئر رومہ" اور "جیش العسرہ" میں مال دیا، اُن کے لیے نبی ﷺ نے جنت کی بشارت دی

(ترمزی – 3701) (صحیح البخاری 2778)

— اور اللہ نے اُن کے دلوں کو مغفرت کے

لائق قرار دیا۔

> رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمْ وَرَضُوا عَنْهُ

”اللہ اُن سے راضی ہوا اور وہ اللہ سے راضی

ہوئے۔“

واللہ تعالیٰ أعلم۔

—

رحمت کی امید

قُلۡ یٰعِبَادِیَ الَّذِیۡنَ اَسۡرَفُوۡا عَلٰۤی اَنۡفُسِہِمۡ لَا تَقۡنَطُوۡا

مِنۡ رَّحۡمَۃِ اللّٰہِ ؕ اِنَّ اللّٰہَ یَغۡفِرُ الذُّنُوۡبَ جَمِیۡعًا ؕ

اِنَّہٗ ہُوَ الۡغَفُوۡرُ الرَّحِیۡمُ ۞

ترجمہ:

کہو (ان سے میری طرف سے کہ) اے میرے

وہ بندو ! جنہوں نے زیادتی کی اپنی جانوں

پر کہ مایوس نہ ہوؤ تم اللہ کی رحمت سے

بیشک اللہ (اپنے کرم و عنایت سے) بخشش

فرماتا ہے سب گناہوں کی بیشک وہ بڑا ہی

بخشنے والا انتہائی مہربان ہے

الزمر - 53

رسول للہ ﷺ نے فرمایا :" اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے ! اگر تم (لوگ) گناہ نہ کرو تو اللہ تعالیٰ تم کو (اس دنیا سے) لے جائے اور (تمہارے بدلے میں) ایسی قوم کو لے آئے جو گناہ کریں اور للہ تعالیٰ سے مغفرت مانگیں تو وہ ان کی مغفرت فرمائے ۔"

صحیح مسلم 6965/2749

ـــ

نبی کریم ﷺ نے فرمایا " بنی اسرائیل

میں ایک شخص تھا جس نے ننانوے خون

ناحق کئے تھے پھر وہ نادم ہو کر (مسئلہ

پوچھنے نکلا ۔ وہ ایک درویش کے پاس آیا

اور اس سے پوچھا کیا اس گناہ سے توبہ

قبول ہونے کی کوئی صورت ہے؟ درویش نے

جواب دیا کہ نہیں ۔ یہ سن کر اس نے

اس درویش کو بھی قتل کر دیا) اور سو

خون پورے کر دئیے) پھر وہ (دوسروں سے

) پوچھنے لگا ۔ آخر اس کو ایک درویش نے

بتایا کہ فلاں بستی میں چلا جا) (وہ

آدھے راستے بھی نہیں پہنچا تھا کہ) اس کی

موت واقع ہو گئی ۔ مرتے مرتے اس نے

اپنا سینہ اس بستی کی طرف جھکا دیا ۔

آخر رحمت کے فرشتوں اور عذاب کے فرشتوں

میں باہم جھگڑا ہوا ۔) کہ کون اسے لے

جائے) لیکن اللہ تعالیٰ نے اس نصرہ نامی

بستی کو) جہاں وہ توبہ کے لیے جا رہا تھا

) حکم دیا کہ اس کی نعش سے قریب ہو

جائے اور دوسری بستی کو (جہاں سے وہ

نکلا تھا) حکم دیا کہ اس کی نعش سے

دور ہو جا ۔ پھر اللہ تعالیٰ نے فرشتوں سے

فرمایا کہ اب دونوں کا فاصلہ دیکھو اور (

جب ناپا تو) اس بستی کو (جہاں وہ

توبہ کے لیے جا رہا تھا) ایک بالشت نعش

سے نزدیک پایا اس لیے وہ بخش دیا گیا ۔

صحیح البخاری - 3470

صحیح مسلم - 2766/7008/7010

نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ ایک بندے

نے بہت گناہ کئے اور کہا : اے میرے رب

! میں تیرا ہی گنہگار بندہ ہوں تو مجھے

بخش دے ۔ اللہ رب العزت نے فرمایا :

میرا بندہ جانتا ہے کہ اس کا کوئی رب

ضرور ہے جو گناہ معاف کرتا ہے اور گناہ کی

وجہ سے سزا بھی دیتا ہے میں نے اپنے بندے

کو بخش دیا پھر بندہ رکا رہا جتنا اللہ نے

چاہا اور پھر اس نے گناہ کیا اور عرض کیا

: میرے رب ! میں نے دوبارہ گناہ کر لیا

، اسے بھی بخش دے ۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا

: میرا بندہ جانتا ہے کہ اس کا رب ضرور

ہے جو گناہ معاف کرتا ہے اور اس کے بدلے

میں سزا بھی دیتا ہے ، میں نے اپنے بندے

کو بخش دیا ۔ پھر جب تک اللہ نے چاہا

بندہ گناہ سے رکا رہا اور پھر اس نے گناہ

کیا اور اللہ کے حضور میں عرض کیا : اے

میرے رب ! میں نے گناہ پھر کر لیا ہے

تو مجھے بخش دے ۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا

میرا بندہ جانتا ہے کہ اس کا ایک رب

ضرور ہے جو گناہ معاف کرتا ورنہ اس کی

وجہ سے سزا بھی دیتا ہے میں نے اپنے بندے

کو بخش دیا ۔ تین مرتبہ ، پس اب جو

چاہے عمل کرے ۔

صحیح البخاری – 7507

نبی ﷺ نے فرمایا

کہ آپ ﷺ نے اپنے رب عزوجل سے نقل

کرتے ہوئے فرمایا :" ایک بندے نے گناہ

کیا ، اس نے کہا : اے اللہ ! میرا گناہ

بخش دے ، تو (اللہ) تبارک و تعالیٰ نے

فرمایا : میرے بندے نے گناہ کیا ہے ، اس

کو پتہ ہے کہ اس کا رب ہے جو گناہ معاف

بھی کرتا ہے اور گناہ پر گرفت بھی کرتا ہے

، اس بندے نے پھر گناہ کیا تو کہا :

میرے رب ! میرا گناہ بخش دے ، تو (

اللہ) تبارک و تعالیٰ نے فرمایا : میرا بندہ

ہے ، اس نے گناہ کیا ہے تو اسے معلوم ہے

کہ اس کا رب ہے جو گناہ بخش دیتا ہے اور

(چاہے تو) گناہ پر پکڑتا ہے ۔ اس بندے

نے پھر سے وہی کیا ، گناہ کیا اور کہا :

میرے رب ! میرے لیے میرا گناہ بخش دے

، تو (اللہ) تبارک و تعالیٰ نے فرمایا :

میرے بندے نے گناہ کیا تو اسے معلوم ہے

کہ اس کا رب ہے جو گناہ بخشتا ہے اور (

چاہے تو) گناہ پر پکڑ لیتا ہے ، (میرے

بندے ! اب تو) جو چاہے کر ، میں نے

تجھے بخش دیا ہے ۔"

عبدالاعلیٰ نے کہا : مجھے (پوری طرح)

معلوم نہیں کہ آپ ﷺ نے تیسری بار

فرمایا یا چوتھی بار :" جو چاہے کر ۔"

صحیح مسلم - 2758/6986

نبی کریم ﷺ نے فرمایا اللہ کے لئے سو

رحمتیں ہیں ان میں سے ایک جنات انسانوں

چوپاؤں اور کیڑوں مکوڑوں کے لئے نازل کی

جس کی وجہ سے وہ ایک دوسرے پر شفقت

و مہربانی اور رحم کرتے ہیں اور اسی کی

وجہ سے وحشی جانور اپنے بچہ پر شفقت کرتا

ہے اور اللہ نے ننانوے رحمتیں بچا کر رکھی

ہیں جن سے قیامت کے دن اپنے بندوں پر

رحمت فرمائے گا۔

صحیح مسلم 6974

ـــــ

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا جب اللہ تعالیٰ مخلوق کو پیدا کرچکے تو اپنے آپ پر اپنے پاس موجود کتاب میں لکھا میری رحمت میرے غصہ پر غالب ہوگئی۔

صحیح مسلم 6971

ـــــ

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے

کہ رسول اللہ کی خدمت میں کچھ قیدی

لائے گئے اور قیدیوں میں سے ایک عورت

کسی کو تلاش کر رہی تھی اس نے قیدیوں

میں اپنے بچے کو پایا اس نے اسے اٹھا کر

اپنے پیٹ سے لگایا اور اسے دودھ پلانا شروع

کردیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں فرمایا

تمہارا کیا خیال ہے کہ یہ عورت اپنے بچہ کو

آگ میں ڈال دے گی؟ ہم نے عرض کیا

نہیں اللہ کی قسم جہاں تک اس کی قدرت ہوئی اسے نہ پھینکے گی تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اس عورت کے اپنے بچہ پر رحم کرنے سے زیادہ اللہ اپنے بندوں پر رحم فرمانے والا ہے۔

صحیح مسلم 6978

رسول للہ ﷺ نے فرمایا ایک آدمی نے ایک

نیکی بھی نہ کی تھی جب وہ مرنے لگا تو

اس نے اپنے گھر والوں سے کہا مجھے جلا

کر میرا آدھا حصہ سمندر میں جبکہ آدھا

حصہ فضا میں اڑا دینا اللہ کی قسم اگر اللہ

اسے عذاب دے گا تو ایسا سخت عذاب دے

گا کہ جہان والوں میں سے کسی کو بھی

ایسا عذاب نہ ہوا ہوگا پس جب وہ آدمی

مرگیا تو اس کے گھر والوں نے وہی کیا جو

انہیں حکم دیا گیا تھا پس اللہ نے فضا کو

حکم دیا تو اس نے اس کے ذرات کو جمع

کردیا اور سمندر کو حکم دیا تو اس نے

بھی اپنے اندرموجود سب کو جمع کردیا پھر

فرمایا تو نے ایسا کیوں کیا اس نے کہا

اے میرے رب تیرے خوف وڈر کی وجہ سے

تو بہتر جانتا ہے پس اللہ نے اسے معاف

فرما دیا۔

صحیح مسلم 6980

نبی ﷺ نے فرمایا کہ اللہ رب العزت

رات کے وقت اپنا ہاتھ پھیلاتا رہتا ہے تاکہ

دن کے گناہ گار کی توبہ قبول کرے اور اپنا

ہاتھ دن کو پھیلاتا رہتا ہے تاکہ رات کے

گناہ گار کی توبہ قبول کرے یہاں تک کہ

سورج مغرب سے طلوع ہو۔

صحیح مسلم 6989

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کوئی ایسا نہیں

جسے اللہ رب العزت سے بڑھ کر تعریف پسند

ہو اسی وجہ سے اس نے اپنی تعریف خود کی

ہے اور نہ ہی کوئی اللہ سے بڑھ کر غیرت

مند ہے اسی وجہ سے بری باتوں کو حرام کیا

ہے اور نہ ہی کوئی ایسا ہے جسے اللہ سے بڑھ

کر عذر قبول کرنا پسند ہو اسی وجہ سے اللہ

نے کتاب نازل کی اور رسولوں کو مبعوث

فرمایا۔

صحیح مسلم 6994

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے

کہ ایک آدمی نے ایک عورت کا بوسہ لیا

پھر اس نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر

ہو کر اس کا ذکر کیا تو یہ آیت کریمہ

(وَأَقِمِ الصَّلَوٰةَ طَرَفَيِ النَّهَارِ وَزُلَفًا مِّنَ الَّيْلِ)

11- ہود- 114) دن کے دونوں حصوں اور رات

کے کچھ حصے میں نماز قائم کرو بیشک

نیکیاں برائیوں کو ختم کردیتی ہیں یہ

نصیحت قبول کرنے والوں کے لئے نصیحت ہے

اس آدمی نے عرض کیا اے اللہ کے رسول

کیا یہ میرے لئے ہے آپ ﷺ نے فرمایا

میری امت میں سے جو بھی عمل کرے گا

اس کے لئے ہے۔

صحیح مسلم 7001

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا :" پاکیزگی نصف

ایمان ہے ۔ الحمد للہ ترازو کو بھر دیتا ہے

۔ سبحان اللہ اور الحمد للہ آسمانوں سے

زمین تک کی وسعت کو بھر دیتے ہیں ۔

نماز/دعا نور ہے ۔ صدقہ دلیل ہے ۔ صبر

روشنی ہے ۔ قرآن تمہارے حق میں یا

تمہارے خلاف حجت ہے ہر انسان دن کا آغاز

کرتا ہے تو (کچھ اعمال کے عوض) اپنا

سودا کرتا ہے ، پھر یا تو خود کو آزاد کرنے
والا ہوتا ہے یا خود کو تباہ کرنے والا ۔”

صحیح مسلم 223

ـــــ

نبی کریم ﷺ نے فرمایا“ صبح کو تم
میں سے ہر ایک شخص کے ہر جوڑ پر ایک
صدقہ ہوتا ہے ، پس ہر ایک تسبیح (

ایک دفعہ سبحان اللہ کہنا) صدقہ ہے ۔ ہر

ایک تمحید (الحمد للہ کہنا) صدقہ ہے ،

ہر ایک تہلیل (لا الہ الا اللہ کہنا)

صدقہ ہے ہر ایک تکبیر (اللہ اکبر کہنا)

بھی صدقہ ہے (اور کسی کو) نیکی کی

تلقین کرنا صدقہ ہے اور (کسی کو) برائی

سے روکنا بھی صدقہ ہے ۔ اور ان تمام امور

کی جگہ دو رکعتیں جو انسان چاشت کے

وقت پڑھتا ہے کفایت کرتی ہیں ۔ ”

صحیح مسلم 720

نبی کریم ﷺ نے فرمایا " روزانہ انسان

کے ہر ایک جوڑ پر صدقہ لازم ہے اور اگر

کوئی شخص کسی کی سواری میں مدد کرے

کہ اس کو سہارا دے کر اس کی سواری پر

سوار کرا دے یا اس کا سامان اس پر اٹھا

کر رکھ دے تو یہ بھی صدقہ ہے ۔ اچھا

اور پاک لفظ بھی (زبان سے نکالنا) صدقہ

ہے ۔ ہر قدم جو نماز کے لیے اٹھتا ہے وہ

بھی صدقہ ہے اور (کسی مسافر کو) راستہ

بتا دینا بھی صدقہ ہے ۔”

صحیح البخاری 2891

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا :“ بنی آدم میں

سے ہر انسان کو تین سو ساٹھ مفاصل (

جوڑوں) پر پیدا کیا گیا ہے ۔ تو جس نے

تکبیر کہی ، اللہ کی حمد کہی ، اللہ کی

وحدانیت کا اقرار کیا ، اللہ کی تسبیح کہی

، اللہ سے مغفرت مانگی ، لوگوں کے راستے

سے کوئی پتھر ہٹایا یا لوگوں کے راستے سے

کانٹا یا ہڈی (ہٹائی) ، نیکی کا حکم

دیا یا برائی سے روکا ، ان تین سو ساٹھ

جوڑوں کی تعداد کے برابر تو وہ اس دن اس

طرح چلے گا کہ وہ اپنے آپ کو دوزخ کی

آگ سے دور کر چکا ہو گا ۔"

صحیح مسلم 2330/1007

ـــ

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا “ اللہ کے کچھ فرشتے ایسے ہیں جو راستوں میں پھرتے رہتے ہیں اور اللہ کی یاد کرنے والوں کو تلاش کرتے رہتے ہیں ۔ پھر جہاں وہ کچھ ایسے

لوگوں کو پا لیتے ہیں کہ جو اللہ کا ذکر

کرتے ہوتے ہیں تو ایک دوسرے کو آواز دیتے

ہیں کہ آؤ ہمارا مطلب حاصل ہو گیا ۔

پھر وہ پہلے آسمان تک اپنے پروں سے ان پر

امنڈتے رہتے ہیں ۔ پھر ختم پر اپنے رب کی

طرف چلے جاتے ہیں ۔ پھر ان کا رب ان

سے پوچھتا ہے .... حالانکہ وہ اپنے بندوں کے

متعلق خوب جانتا ہے .... کہ میرے بندے

کیا کہتے تھے ؟ وہ جواب دیتے ہیں کہ وہ

تیری تسبیح پڑھتے تھے ، تیری کبریائی بیان

کرتے تھے ، تیری حمد کرتے تھے اور تیری

بڑائی کرتے تھے ۔ پھر اللہ تعالیٰ پوچھتا ہے

کیا انہوں نے مجھے دیکھا ہے ؟ کہا کہ وہ

جواب دیتے ہیں نہیں ، واللہ ! انہوں نے

تجھے نہیں دیکھا ۔ اس پر اللہ تعالیٰ فرماتا

ہے ، پھر ان کا اس وقت کیا حال ہوتا

جب وہ مجھے دیکھے ہوئے ہوتے ؟ وہ جواب

دیتے ہیں کہ اگر وہ تیرا دیدار کر لیتے تو

تیری عبادت اور بھی بہت زیادہ کرتے ،

تیری بڑائی سب سے زیادہ بیان کرتے ، تیری

تسبیح سب سے زیادہ کرتے ۔ پھر اللہ تعالیٰ

دریافت کرتا ہے ، پھر وہ مجھ سے کیا

مانگتے ہیں ؟ فرشتے کہتے ہیں کہ وہ جنت

مانگتے ہیں ۔ بیان کیا کہ اللہ تعالیٰ دریافت

کرتا ہے کیا انہوں نے جنت دیکھی ہے ؟

فرشتے جواب دیتے ہیں نہیں ، واللہ اے رب

! انہوں نے تیری جنت نہیں دیکھی ۔ بیان

کیا کہ اللہ تعالیٰ دریافت کرتا ہے ان کا اس

وقت کیا عالم ہوتا اگر انہوں نے جنت کو

دیکھا ہوتا ؟ فرشتے جواب دیتے ہیں کہ اگر

انہوں نے جنت کو دیکھا ہوتا تو وہ اس سے

اور بھی زیادہ خواہشمند ہوتے ، سب سے بڑھ

کر اس کے طلب گار ہوتے اور سب سے زیادہ

اس کے آرزو مند ہوتے ۔ پھر اللہ تعالیٰ

پوچھتا ہے کہ وہ کس چیز سے پناہ مانگتے

ہیں ؟ فرشتے جواب دیتے ہیں ، دوزخ سے ۔

اللہ تعالیٰ پوچھتا ہے کیا انہوں نے جہنم کو

دیکھا ہے ؟ وہ جواب دیتے ہیں نہیں ، واللہ

، انہوں نے جہنم کو دیکھا نہیں ہے ۔ اللہ

تعالیٰ فرماتا ہے ، پھر اگر انہوں نے اسے

دیکھا ہوتا تو ان کا کیا حال ہوتا ؟ وہ

جواب دیتے ہیں کہ اگر انہوں نے اسے دیکھا

ہوتا تو اس سے بچنے میں وہ سب سے آگے

ہوتے اور سب سے زیادہ اس سے خوف کھاتے

۔ اس پر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میں تمہیں

گواہ بناتا ہوں کہ میں نے ان کی مغفرت کی

۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ اس پر ان

میں سے ایک فرشتے نے کہا کہ ان میں

فلاں بھی تھا جو ان ذاکرین میں سے نہیں

تھا ، بلکہ وہ کسی ضرورت سے آ گیا تھا

۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے کہ یہ (ذاکرین) وہ لوگ ہیں جن کی مجلس میں بیٹھنے والا بھی نامراد نہیں رہتا ۔

صحیح البخاری 6408

صحیح مسلم 2689

▬▬ ▬ ▬ ▬

سارے غموں سے نجات کی دعا

1■

پہلے بسم اللہ سے آغاز کرے یہ بھی حمد

میں شامل ہے ۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

2■

پھر اللہ کی حمد و ثنا کرے۔

الحمد للّٰہ رب العالمین، ربنا، وغیرہ

■ 3

پھر درود شریف پڑھے ۔

اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی آلِ مُحَمَّدٍ وَبَارِکْ وَسَلِّمْ

■ 4

پھر دعا میں صرف درود شریف پڑھے ۔

صلی اللّٰہ علیہ وسلم۔ ۔ سو

بار

نوٹ: سو بار بدعت غیر دین ہے۔ کم و

بیش پڑھا جا سکتا ہے، تین بار بھی کافی ہے

اور دعا میں صرف "صلی اللّٰہ علیہ وسلم" یعنی

درود شریف پڑھے ۔

5 ▪

آمین پر دعا ختم کرے

---------------+++-----

دلائل

1■

ہر کام سے پہلے بسم اللّٰہ پڑھنا مستحب ہے

3■ & 2

رسول اللّٰہ ﷺ نے فرمایا:

> "جب تم میں سے کوئی دعا کرے تو اللہ کی حمد و ثنا سے آغاز کرے، پھر نبی ﷺ پر درود بھیجے، اس کے بعد جو چاہے مانگے۔"

سنن ابوداؤد: حدیث 1481

رسول اللہ ﷺ ہم لوگوں کے ساتھ (مسجد میں) تشریف فرما تھے، اس وقت ایک شخص مسجد میں آیا، اس نے نماز پڑھی، اور یہ دعا کی: اے اللہ! میری مغفرت

کر دے اور مجھ پر رحم فرما، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”اے نمازی! تو نے جلدی کی، جب تو نماز پڑھ کر بیٹھے تو اللہ کے شایان شان اس کی حمد بیان کر اور پھر مجھ پر صلاۃ (درود) بھیج، پھر اللہ سے دعا کر“، کہتے ہیں: اس کے بعد پھر ایک اور شخص نے نماز پڑھی، اس نے اللہ کی حمد بیان کی اور نبی اکرم ﷺ پر درود بھیجا تو نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

“اے نمازی! دعا کر، تیری دعا قبول کی

جائے گی”۔

ترمذی 3476

■ 4

اُبیّ بن کعب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ

میں نے عرض کیا:

"یا رسول اللہ! اگر میں اپنی تمام دعا آپ

پر درود میں تبدیل کر دوں تو؟"

آپ ﷺ نے فرمایا:

> "تو پھر تیرے سارے غم دور کر دیے جائیں گے اور تیرے گناہ معاف کر دیے جائیں گے۔"

جامع الترمذی: حدیث 2457

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

"نبی کریم ﷺ جب دعا فرماتے تو تین مرتبہ دعا فرماتے، اور جب کسی چیز کا سوال کرتے تو تین بار سوال فرماتے۔"

صحیح مسلم 1794

■ 5

آمین

دعا کے آخر میں "آمین" کہنا سنت ہے۔

دلیل:

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

> "جب امام 'وَلَا الضَّالِّينَ' کہے تو تم آمین
> کہو، کیونکہ جس کی آمین فرشتوں کی آمین

سے مل جائے، اس کے پچھلے گناہ معاف کر

دیے جاتے ہیں۔"

(صحیح بخاری: حدیث 780، صحیح مسلم:

410)

—

نوٹ:

اس دعا کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ انسان

دیگر حاجات اور دعائیں مانگنا چھوڑ دے اور

صرف درود شریف ہی دعا میں پڑھے۔

یہ دراصل غموں سے نجات کے لیے ایک

مکمل دعا کا طریقہ ہے، جس میں اللہ کی

حمد، درود شریف، دعا میں صرف درود شریف،

اور آخر میں آمین شامل ہیں۔

دن میں کم از کم ایک بار ایسی مکمل

دعا مانگے جس میں صرف درود شریف ہو،

تاکہ تمام غموں سے نجات کی یہ خاص دعا

بھی ادا ہو جائے۔

اس کے بعد دیگر دعائیں بھی مانگی جا سکتی

ہیں، اسی ترتیب کے ساتھ: پہلے اللہ کی حمد

و ثنا، پھر درود شریف، پھر اپنی حاجت کا ذکر، اور آخر میں آمین کہہ کر دعا مکمل کرے۔

—

واللہ تعالیٰ اعلم

—

ربنا تقبل منا انک انت السميع العليم

والحمد للّٰہ رب العالمين